دیوندر ستیارتھی

اور بنسری بجتی رہی

انڈین اکیڈیمی - لاہور

کاپی رائٹ

مصنّف

۱۹۴۶ء

تین روپے

ملنے کا پتہ:

انڈین اکیڈمی۔ لوہاری گیٹ لاہور

سعادت حسن منٹو کے نام

"میں ادھر جاؤں در سے ترے بن صدا کئے"

پیش لفظ

جدید ایشیائی، خصوصاً ہندوستانی افسانہ میں مشاہدہ اور فکر سے لبریز خارجی حقیقت نگاری نمایاں ہے تو افسانہ نگار کے شخصی اور داخلی تاثرات اور احساسات کی بھی کچھ کم مثالیں نہیں ملتی ہیں حالات و واقعات کے پیش نظر جدید افسانہ نگار نئے زاویہ نگاہ کو اپنانے پر مجبور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے پیش رو افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو اپنا ورثہ ماننے سے انکار کرے۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ ادبی ارتقاء کا یہی تقاضا ہے کہ اجتماعی شعور کو انفرادی شعور کا لازمی نتیجہ قرار دیا جائے۔

پریم چند نے مشرقی اور مغربی رنگوں کی آمیزش سے افسانے کو نئی تکنیک کا حامل بنایا۔ اگرچہ جدید افسانہ پریم چند کے افسانوں سے بہت مختلف نظر آتا ہے تاہم یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ جہاں تک واقعیت اور حقیقت نگاری کا تعلق ہے جدید افسانہ نگار پریم چند کو اپنا امام سمجھتا ہے "کفن" ہندوستانی گاؤں کے ذرے ذرے کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ انہی ذروں

ہیں گھسے پٹے باپ بیٹا لاش میں بدلی ہوئی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے الاؤ کے گرد بیٹھے آلو بھون بھون کر کھا رہے ہیں پھر اسی لاش کو کفنانے کی غرض سے گاؤں والوں سے پیسے جمع کرنے کے بعد تاڑی خانے پہنچ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ بھی خوب مزہ رہا کہ جو عورت عمر بھر ہمیں جتنی الفت سے آرام پہنچاتی رہی آج دردِ زہ سے مر کر بھی ہمارے نشہ پانی کا سامان بہم پہنچا گئی۔ پریم چند کے افسانے مقامی رنگ کے کرشمے ہیں۔ اس کی نظر میں وسعت، تیزی اور گہرائی پیش پیش ہے تو زاویۂ نگاہ میں بے پناہ ہمہ گیری۔ اُس کے افسانے زندگی کی طرح متنوع ہیں۔ دیہاتی زندگی کا اتنا بڑا افسانہ نگار پھر نہ جانے کب پیدا ہوگا۔ اکثر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ اس کے آخری دور کی تخلیقات پر تبلیغی عنصر چھا گیا ہے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ وقت ادب کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور جب وقت ایک نہایت نازک مرحلے سے گزر رہا ہو تو ادب دور کھڑا ایک تماشائی کی طرح اُس کے نظارے کی تاب نہیں لا سکتا وہ اس سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔

جدید افسانہ نگار نعروں کی حد سے گزر کر زندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچ گیا ہے آج وہ داخلیت اور خارجیت کا ایک توازن قائم کیا چاہتا ہے تاکہ ادبی دیانتداری کی ذمہ داری نبھا سکے وہ حال سے ماضی کی طرف نہیں، مستقبل کی طرف جانے کا قصد کر چکا ہے۔ اسے یہ ہرگز پسند نہیں کہ ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے گرد روایات کے جال بنتے ہوئے موت سے ہمکنار ہو جائے۔ وہ آزادی چاہتا ہے اسے غلامی سے نفرت ہے۔ وہ انسان کی عظمت کا قائل ہے بت شکن کی طرح وہ آگے بڑھ کر اس بت پر وار کرنا چاہتا ہے جس نے جنتا کو اپنے روبرو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر رکھا ہے۔

میرا اصل کام لوک گیت تحریک کو پروان چڑھانا ہے۔ لوک گیتوں کی تلاش میں میں نے جوانی کا

بیش قیمت حصہ صرف کیا ہے اور اگرچہ خانہ بدوشیت کیلئے وہ پہلا سا حوصلہ اب قائم نہیں رہا ’’اڑ کا چکر‘‘ ابھی تک تھما نہیں۔ ’’میں ہوں خانہ بدوش‘‘ اور ’’گائے جا ہندوستان‘‘ کے اوراق میں میری آواز جنتا کی بے پناہ قوت کی حامل ہے ۔۔۔۔ جنتا جو سماجی و معاشرتی ارتقاء کی متعدد منزلوں کو طے کرتے ہوئے نغمہ و رقص کے زیر و بم کی تخلیق کرتی ہے اور قدم قدم پر اسے نئی ترتیب سے مزین کئے جاتی ہے۔

افسانہ نگاری کی طرف میرا جھکاؤ میری خانہ بدوشی کا مرہونِ منت ہے۔ اپنے ماحول کی کم مائیگی کا مجھے اعتراف ہے۔ لیکن جہاں تک مشاہدے کا تعلق ہے، میں نے کبھی آنکھ بند نہیں کی۔ سراسر خاموشی سے زمین کا سینہ ٹٹولنے والی نگاہوں کے جائزے سے لے کر کے میں نے سبکی سب برابر سماج کی طرف تیزی سے قدم بڑھانے والے لوگوں کی احتجاجی گھن گرج بھی سنی ہے، جسے عرفِ عام میں بغاوت کا پیش خیمہ کہا جاتا ہے۔ تکنیک سے کہیں زیادہ میں موضوعِ سخن کا قائل ہوں۔ ’’نئے دیوتا‘‘ [illegible] ’’طوفانِ نوح تک‘‘ کے بعد یہ افسانے پیش کرتے ہوئے میں ادارہ ’’ادبِ لطیف‘‘، ’’ہمایوں‘‘، ’’ساقی‘‘، ’’آجکل‘‘ [illegible] کا شکریہ بجا لانا فراموش نہیں کر سکتا جن کے ہاں ان کی پہلی اشاعت عمل میں آئی۔ پروفیسر کنھیا لال کپور نے مقدمہ لکھنے کی نوازش کی۔ اور ملک کے ممتاز فنکار جناب چغتائی کا ممنون ہوں، جن کے ایک نقش سے سرورق کو مزین کیا گیا ہے۔

’’جنتا جنتا‘‘
سنت نگر، لاہور
۳۰ جنوری ۱۹۴۶ء

دیوندر ستیارتھی

مقدمہ

دیوندر ستیارتھی کے افسانوں میں مختلف تاثرات اِس خوبی سے باہم دگر ملے ہوئے ہیں کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کونسا تاثر پیدا کرنے میں منفرد ہے۔ باوجود اس امر کے انکی انفرادیت قائم ہے۔ اُس کا طرۂ امتیاز نفسیاتی جزئیات نگاری ہے۔ اسے خارجی دنیا سے بظاہر کوئی دلچسپی نہیں، اگر وہ ایک آدھ واقعہ اس دنیا سے کبھی کبھار لیتا بھی ہے تو اِس لئے کہ اُسے عوام کی تسکین خاطر منظور ہے! اس کی دنیا داخلی دنیا ہے اور اس دنیا میں وہ ایک ماہرِ نفسیات کی طرح نہ صرف خود ہی کھو جاتا ہے بلکہ قاری کو بھی مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس انوکھی عجیب اور تحیر کُن دنیا میں گم ہو کر رہ جائے۔ یہ "ذہن" اُس کے لئے صحرا بھی ہے اور وادی بھی! اس عجیب و غریب دشت کی صحرا نوردی وہ خضر کی بلند حوصلگی اور خود اعتمادی کے ساتھ کرتا ہے۔

"ننھے دیوتا" میں شبنما ایک حیرت انگیز مطالعہ ہے جسے نفسیاتی کردار نگاری کا شاہکار کہا جا سکتا

ہیں گھسے رہتے ہیں باپ بیٹا لاش میں بدلی ہوئی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے الاؤ کے گرد بیٹھے آلو بھون بھون کر کھاتے رہتے ہیں پھر اسی لاش کو کفنانے کی غرض سے گاؤں والوں سے پیسے جمع کرنے کے بعد تاڑی خانے پہنچ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ بھی خوب مزہ رہا کہ جو عورت عمر بھر ہمیں حتی الوسع آرام پہنچاتی رہی آج دردِ زہ سے مر کر بھی ہمارے نشہ پانی کا سامان بہم پہنچا گئی۔ پریم چند کے افسانے مقامی رنگ کے کرشمے ہیں۔ اس کی نظر میں وسعت، تیزی اور گہرائی پیش پیش ہے تو زاویۂ نگاہ میں بے پناہ ہمہ گیری۔ اس کے افسانے زندگی کی طرح متنوع ہیں۔ دیہاتی زندگی کا اتنا بڑا افسانہ نگار پھر نہ جانے کب پیدا ہوگا۔ اکثر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ ان کے آخری دور کی تخلیقات پر تبلیغی عنصر چھا گیا ہے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ وقت ادب کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور جب وقت ایک نہایت نازک مرحلے سے گزر رہا ہو تو ادب دور کھڑا ایک تماشائی کی طرح اس کے نظارے کی تاب نہیں لا سکتا وہ اس سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔

جدید افسانہ نگار نعروں کی حد سے گزر کر زندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچ گیا ہے آج وہ داخلیت اور خارجیت کا ایک توازن قائم کیا چاہتا ہے تاکہ ادبی دیانتداری کی ذمہ داری نبھا سکے وہ حال سے ماضی کی طرف نہیں مستقبل کی طرف جانے کا قصد کر چکا ہے۔ اسے یہ ہرگز پسند نہیں کہ ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے گرد روایات کے جال بنتے ہوئے موت سے ہمکنار ہو جائے وہ آزادی چاہتا ہے اسے غلامی سے نفرت ہے۔ وہ انسان کی عظمت کا قائل ہے بت شکن کی طرح وہ آگے بڑھ کر اس بت پر وار کرنا چاہتا ہے جس نے جنتا کو اپنے روبرو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر رکھا ہے۔

میرا اصل کام لوک گیت تحریک کو پروان چڑھانا ہے۔ لوک گیتوں کی تلاش میں میں نے جوانی کا

بیش قیمت حصہ صرف کیا ہے اور اگرچہ "خانہ بدوش" بت کیلئے وہ پہلا سا حوصلہ اب قائم نہیں رہا "ڈاک" کا چکر" ابھی تک تھما نہیں، "میں ہوں خانہ بدوش" "اور گائے جا ہندوستان" کے اوراق میں میری آواز جنتا کی بے پناہ قوت کی حامل ہے ۔۔۔ جنتا جو سماجی و معاشرتی ارتقاء کی متعدد منزلوں کو طے کرتے ہوئے نغمہ و رقص کے زیر و بم کی تخلیق کرتی ہے اور قدم قدم پر اسے نئی ترتیب سے مزین کئے جاتی ہے۔

افسانہ نگاری کی طرف میرا جھکاؤ میری خانہ بدوشی کا مرہونِ منت ہے۔ اپنے ماحول کی کم مائیگی کا مجھے اعتراف ہے لیکن جہاں تک مشاہدے کا تعلق ہے، میں نے کبھی آنکھ بند نہیں کی۔ سراسر خاموشی سے زمین کا سینہ ٹٹولنے والی نگاہوں کے جاننے سے لے کر کے میں نے سب کی سب برابر سماج کی طرف تیزی سے قدم بڑھانے والے لوگوں کی احتجاجی گھن گرج بھی سنی ہے، جسے عرفِ عام میں بغاوت کا پیش خیمہ کہا جاتا ہے۔ تکنیک سے کہیں زیادہ میں موضوعِ سخن کا قائل ہوں۔ "نئے دیوتا" [illegible] طوفانِ نوح تک" کے بعد یہ افسانے پیش کرتے ہوئے میں ادارہ "ادبِ لطیف"، "ہمایوں"، "ساقی"، "آجکل" [illegible] کا شکریہ بجا لانا فراموش نہیں کر سکتا جن کے ہاں ان کی پہلی اشاعت عمل میں آئی۔ پروفیسر کنھیا لال کپور نے مقدمہ لکھنے کی نوازش کی۔ اور ملک کے ممتاز فنکار جناب چغتائی کا ممنون ہوں، جن کے ایک نقش سے سرورق کو مزین کیا گیا ہے۔

"جنتا جنتا"
سنت نگر، لاہور
۳۰ جنوری ۱۹۴۶ء

دیوندر ستیارتھی

مقدمہ

دیوندر ستیارتھی کے افسانوں میں مختلف تاثرات اِس خوبی سے باہم دِگر ملے ہوئے ہیں کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کونسا تاثر پیدا کرنے میں منفرد ہے۔ باوجود اس امر کے اُنکی انفرادیت قائم رہتی ہے۔

اُس کا طرۂ امتیاز نفسیاتی جزئیات نگاری ہے۔ اسے خارجی دنیا سے بظاہر کوئی دلچسپی نہیں، اگر وہ ایک آدھ واقعہ اس دُنیا سے کبھی کبھار لیتا بھی ہے تو اِس لئے کہ اُسے عوام کی تسکین خاطر منظور ہے! اِس کی دنیا داخلی دنیا ہے اور اس دنیا میں وہ ایک ماہرِ نفسیات کی طرح نہ صرف خود ہی کھو جاتا ہے بلکہ قاری کو بھی مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس انوکھی عجیب اور تحیر کُن دنیا میں گم ہو کر رہ جائے۔ "ذہن" اُس کے لئے صحرا بھی ہے اور وادی بھی! اس عجیب و غریب دشت کی صحرا نوردی وہ خضر کی بلند حوصلگی اور خود اعتمادی کے ساتھ کرتا ہے۔

"نئے دیوتا" میں شبنم ایک حیرت انگیز مطالعہ ہے جسے نفسیاتی کردار نگاری کا شاہکار کہا جا سکتا

ہے۔ جہاں تک خارجی واقعات کا تعلق ہے وہ اس افسانے سے یکسر غائب ہیں۔ ایک اوسط درجے کا قاری جسے افسانے
میں ازل سے کہانی کی تلاش رہی ہے اسے پڑھکر شاید یہ کہنے پر اُتر آئے کہ شبنم میں کہانی کا عنصر صرف اتنا ہے کہ ایک
ادھیڑ عمر کی طوائف اپنے اڈے پر بیٹھی ہے اور بیٹھی رہتی ہے لیکن کہانی کے مطالبہ سے قطع نظر ــــ اور کہانی کا مطالعہ
آخر کار طفلانہ مطالبہ نہیں تو اور کیا ہے۔ افسانے کی تاروپود پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عجیب عجیب حیرت انگیز
جزئیات نگاری کا ایک طوفان ہے جو اُمڈا چلا آتا ہے۔ طوائف کی کس مپرسی اسکے پیشے اسکے آلام و مصائب اسکی
زندگی کی لمحہ بہ لمحہ تاریک ہوتی ہوئی شام، اُس کا ڈھلتا ہوا جوبن اسکی بڑھتی ہوئی بے بسیاں اُس کا ہم پیشہ نوجوان
طوائفوں سے حسد و رشک اسکی محبوبیاں اور لاچاریاں اور ان سب سے بڑھکر اسکے بچپن اور الھڑپن کی حسرتناک یادیں اسکے
دماغ میں مچلتے ہوئے امید و بیم کے خوفناک طوفان یہ سب فنکار اس چابکدستی سے بیان کر گیا ہے کہ شبنم طوائف ہوتے
ہوئے بھی صنفِ نازک کا نادر ترین نمونہ معلوم ہونے لگتی ہے اور چند لمحوں کیلئے اُس کا ذہن ہمارے لئے بازارِ حسن سے
بھی زیادہ نورانی اور خوبصورت بن جاتا ہے۔ شبنم میں افسانہ نگار نے بیک وقت چیخوف اور موپاساں سے تکنیک لی ہے
چھوٹی سے چھوٹی چیز اور حقیر سے حقیر واقعہ ستیارتھی کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ بات جہاں اُردو
ادب میں نئی ہے وہاں نیک فال بھی ہے۔ آٹوگراف بک اور یہ آدمی یہ بیل اسی تکنیک کے حامل ہیں۔
بادی النظر میں آٹوگراف بک ایک ایسی بیکار چیز ہے جس کا کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن ستیارتھی نے جس
فنکاری سے اسے ایک کامیاب افسانے کا موضوع بنایا ہے یہ کچھ اسی کا حصہ ہے کسی معروف آدمی کے ہاتھ کی
لکھی ہوئی ایک سطر کسی کے بلند خیال پر تازیانے کا کام کرتی ہے اور وہ سوچتے سوچتے ایسی دنیا میں پرواز کرنے
لگتا ہے۔ جہاں تخیل حاکم ہے اور حسن محکوم۔ یہ آدمی یہ بیل میں بامعنی علامت کو جمہوریت اور اشتراکیت کے
فلسفوں میں یوں سمویا گیا ہے کہ اشتراکیت جیسا ٹھوس نظریہ قوسِ قزح سے زیادہ حسین نظر آتا ہے۔

علامیت اور اشاریت ستیارتھی کے دو آزمودہ ہتھیار ہیں۔ وہ ان کو بہت کامیابی کے ساتھ استعمال کرتا ہے اور اس کے بہت سے افسانوں کی کامیابی میں ان دونوں کا ہاتھ ہے۔

"لال دھرتی" میں اشاریت اپنے عروج پر ہے۔ سرخ رنگ کی علامت سے ہوشیار فنکار نے ایک سے زیادہ کام نکالے ہیں اور اس افسانے کے عروج میں نوکمال کا نکتہ پیدا کیا ہے "دائیں بائیں آمنے سامنے جہاں تک میرے ذہن کی پہنچ تھی سرخ زمین لیٹی ہوئی تھی —— ایک حسینہ کی طرح وہ آرام کر رہی تھی۔ وہ وقت مجھے قریب آتا دکھائی دیا جب اس کی کوکھ ہری ہو گئی اور ایسا کوئی آدمی پیدا ہو گا جو باآواز بلند پکار کر کہہ اٹھیگا —— ہلوں کی جے۔ اب ان کھیتوں میں غلام نہیں اگیں گے۔ یہ لال دھرتی ہے"۔ یہ ان افسانوں میں سے ہے جن کی عظمت کو محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن بیان نہیں کیا جا سکتا جن کا تجزیہ کرنا اتنا ہی مشکل اور شاید اتنا ہی احمقانہ فعل ہے جتنا پھول کی رنگت اور خوشبو کا۔ اس افسانے کی فضا میں عبیر اور گلال اڑ رہے ہیں اور سرخ سبز اور سفید رنگ غصے بعد رہت جگنوؤں کیطرح اپنی چمک دکھا کر غائب اور نمودار ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دھرتی لال ہے بعینہ اس دوشیزہ کی طرح جسے زندگی میں پہلی بار احساس بلوغت ہوا ہے۔ لال دھرتی اب سن بلوغت کو پہنچ چکی ہے۔

ہزاروں سالوں کے جمود اور سکون کے بعد دھرتی میں ایک زلزلہ آیا چاہتا ہے۔ یا وہ لوح گونڈ کاشتکار جو ان دیوتا کے آسرے پر بیٹھے ہوئے اپنے خشک اور بنجر کھیتوں کی طرف حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے اب ان دیوتا کے خلاف جہاد کرنے پر کمر بستہ ہوئے ہیں۔ ستیارتھی کا افسانہ "ان دیوتا" ہندوستان کی اس پسماندہ قوم کے خیالات کا مرقع ہے جو کسی وقت ہندوستان کی آدھ ماتا تھی مگر اب مٹھی بھر چاولوں کیلئے ان دیوتا کی رہین منت ہو کر رہ گئی ہے جسے ہمدردی اور خلوص کیساتھ ستیارتھی نے گونڈ لوگوں کی رسوم اور توہمات کی ترجمانی کی ہے۔ اس

کی نظیر ہمارے ادب میں بہت کم ملے گی۔ شدتِ تاثر کے علاوہ اس افسانے کی بے عیب تکنیک اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ستیارتھی کو افسانہ نویسی کے فن پر قابلِ رشک عبور حاصل ہے۔

"نئے دیوتا" ستیارتھی کے مخصوص رنگ سے ہٹ کر ہے۔ یہ اس مشکل ترین تکنیک کا نمونہ ہے جسے ہم طنزیہ افسانہ نگاری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ نفاستِ حسن کو اپنی بے پناہ طنز کا نشانہ بنا کر ستیارتھی نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو طنز کے میدان کا بھی شہسوار ہو سکتا ہے۔ اس افسانے میں ایک مشہور افسانہ نگار کی ایک دن کی زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے یا زیادہ صحیح لفظوں میں خاکہ اڑایا گیا ہے۔ نفاست حسن جیتا جاگتا کردار ہے جس کی زندگی کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اس خوبی کے ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے کہ اگر قاری میں حسنِ مذاق کی ذرا بھی رمق موجود ہے تو اسے اس کی داد دینا چاہئے۔

۲

ستیارتھی کے افسانوں میں حیرت انگیز تنوع ہے۔ عام افسانہ نگاروں کی طرح وہ ایک ہی پلاٹ کا بار بار اعادہ نہیں کرتا۔ وہ تمام مسائل اور موضوعات جن سے زندگی کی فراوانی قائم ہے، اُس کے افسانوں کے پلاٹ ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو سے ہم آہنگ ہو کر وہ نئے نغمے اور نئی تانیں تلاش کر لیتا ہے۔

"نئے دیوتا" کے بعد کے افسانوں میں "اُگلے طوفانِ نوح تک" میں طنز کی شدت اور تندی اس انتہا پر پہنچ گئی ہے کہ اگر "نئے دیوتا" چپت تھی تو "اُگلے طوفانِ نوح تک" طمانچہ ہے۔ اس قابلِ نفرت ہستی کے منہ پر طمانچہ جو ازل سے ادیبوں کا خون پیتی رہی ہے اور جس کی عظمت اور امارت ادبا کی محنت اور مشقت کی شرمندۂ احسان ہے۔ ناشر اور بلی کا تقابل اس افسانے کی جان ہے۔ ناشر کسی بھی زبان اور کسی بھی ملک کا ناشر ہمیشہ اپنے ادیبوں کے خون سے ہاتھ رنگتا رہا ہے۔ بالکل اس بلی کی طرح جو معصوم کبوتر یا چوہے کو دیکھ کر اس پر جھپٹنے سے باز نہیں آ سکتی۔ اِس

افسانے کے اختتام پر ستیارتھی نے جو نکتہ پیدا کیا ہے، وہ اس قابل ہے کہ اسے استادانہ چوٹ کہا جا سکے۔

'دھوڑا سا لکھوؤ اور کانگڑی' میں اجتماعی نفسیات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ہجوم جذبات کا غلام ہے اور جذبات کی رَو
میں بہہ جاتا ہے۔ ہجوم عقلی استدلال کو بھول کر بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح عجیب و غریب کیتی کرتا ہے۔ 'جھوڑا سا لکھوؤ'
میں بنگالیوں کے محبوب شاعر کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ لیکن ہجوم کے اوپر یہ وہم سوار ہے کہ شاعر کی عظمت اسکی داڑھی
اور بالوں میں نہاں ہے اسلئے ہر ایک شخص اسکی داڑھی پر جھپٹنے کیلئے بیقرار ہے۔ شاعر کے نغمے، اسکی آرائیں، اس کے
آفاقی گیت یعنی وہ ذہنی میراث جو وہ اپنے مداحوں کیلئے چھوڑ رہا ہے، ہجوم کی نظر میں زیادہ قیمت نہیں رکھتی
اگر کوئی چیز انہیں دکھائی دے سکتی ہے تو وہ ہیں اسکی داڑھی کے بال! ایک دوسرے کو گالیاں دیتے دھکیلتے، پولیس کی
لاٹھیاں کھاتے اور ادھر بھی پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اس افسانہ میں اجتماعی ذہنیت کی دلچسپ جھلکیاں ہیں جو بیدار
ہیرو میں کی طرح افسانہ نگار ہجوم کے ذہن کو مختلف زاویوں سے دکھاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں اجتماعی ذہن سے
وہ بہاتا ہے اور جب وہ اٹھاتا ہے تو عجیب و غریب انکشافات ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اجتماعی انسان نہایت مضحکہ خیز
جانور نظر آنے لگتا ہے۔ 'کانگڑی' میں کشمیر پس منظر ہے اور کشمیری کردار۔ اس افسانے کا ہیرو بھی ہجوم ہے۔ نعرے لگانے
والا ہجوم کشمیری ہے تو ہندوستان کی مظلوم ترین قوم سہی لیکن احساس خودی سے وہ بھی عاری نہیں۔ اپنے عزیز
سیاسی لیڈر کی خاطر کشمیری جوان مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں لیکن ہجوم میں گھسے ہو کر وہ لائحہ عمل سے بھٹک
جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں اتنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا کرنے والے تھے اور کیا کر رہے ہیں۔ ہجوم کا اپنا علیحدہ
جادو ہے۔ ایسا جادو جو فوراً انفرادی انسان کو اجتماعی جانور میں تبدیل کر دیتا ہے۔

'چھیت' میں افسانہ نگار ہمیں اڑیسہ لے چلتا ہے۔ بقول صلاح الدین احمد یہ وہ چھیت ہے جو سماج فرد کے منہ
ہمیشہ سے لگاتی چلی آئی ہے اور شاید ہمیشہ لگاتی چلی جائے گی۔ آنیوالی دنیا میں مرد اور اسکی زندگی کی محدود

کیفیتوں کیلئے شاید اتنی بھی گنجائش نہ رہے جتنی ابتک اسے ملتی رہی ہے مستقبل قریب کے لئے کوئی پیغام نہیں رکھتا حال اسے کوئی دلاسا نہیں دے سکتا۔ پھر وہ کونسی چھاندی میں جاکر ڈوب جائے۔ ستیارتھی نے اس درد انگیز سوال کا مصورانہ جواب دینے کی کوشش کی ہے۔[1]

بنگال کے قحط سے متاثر ہوکر ستیارتھی نے چند شاہکار افسانوں کی تخلیق کی ہے۔ "قبروں کے بیچوں بیچ" اس المیہ کی ایک جامع اور واضح جھلک ہے۔ اس میں سیاسی پراپگنڈہ ہے نہ فلسفیانہ بحث۔ افسانہ نگار تنقید اور تبصرہ سے عمداً احتراز کرتا ہے۔ لیکن اسکے باوجود یہ افسانہ بنگال کے قحط پر کڑی تنقید اور سخت ترین تبصرہ کا حکم رکھتا ہے۔ حسرت اور رنج کی لہر اسکے ہر فقرے سے ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ قاری کے ذہن پر یاس اور الم کی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کم ہیں اور درندے زیادہ، یا یہ کہ اس دنیا میں درندے ہی درندے ہیں اور انسان ابھی پیدا نہیں ہوا۔ "نئے دھان سے پہلے" میں اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ امید کی کرن بھٹک کر رہ گئی ہے۔ نیا دھان ضرور آئیگا لیکن ؎ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک کے مصداق نئے دھان کو لہلہاتا دیکھنے والے قبروں کی گود میں سو رہے ہونگے۔ نیا دھان ان قبروں پر آگیگا اور اسکے خوبصورت خوشے بے گور و کفن لاشوں پر سایہ بن کر لہلہائینگے لیکن اس سے انہیں کیا فائدہ۔ زندگی میں وہ دو مٹھی چاولوں سے محروم رہے۔ اب اگر دھان کا پورا کھیت بھی ان کی قبروں کو اپنے آغوش میں لے لے تو ان کی بلا سے۔ ان کے علاوہ بنگال کے المیہ کے گرد گھومنے والے افسانوں میں "دوراہا" اور "پھر وہی کنج قفس" جدید اردو افسانہ نگاری کی جدید ترین تکنیک کے حامل ہیں۔ "ان داتا" کا مصنف کرشن چندر بھی ستیارتھی کے ان افسانوں کو خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہے۔

---

[1] ادبی دنیا، جولائی ۱۹۴۴ء

پیشِ نظر مجموعہ میں ستیارتھی کا فن اُس پختگی اور ہمہ گیری کا حامل ہے جو فن کے شہ پاروں کے حصہ میں آتی ہے! ان افسانوں میں ستیارتھی زندگی کا تماشبین نہیں، تجزیہ نگار ہے وہ زندگی سے کما حقہ طور پر پیوست گریباں نظر آتا ہے! اور زندگی کے ہر لمحہ بدلتے ہوئے زیر و بم کی نہایت چابکدستی سے صدا بندی کرتا ہے ان افسانوں کی خصوصیت ان کے پلاٹوں کے اچھوتے پن میں مضمر ہے ستیارتھی کیلئے زندگی بجائے خود ایک افسانہ ہے جس کا اختتام طربیہ بھی ہے اور المیہ بھی۔ زندگی کے نازک ترین احساسات ہی جو انسان کا بہترین سرمایہ ہیں ان افسانوں کے موضوعات ہیں۔

ستیارتھی پر دلدادہ فنکار ہے! اسلئے اس کا فن ان افسانوں میں بدرجہ اتم چمکتا ہے جو کہانیاں مرد و زن اور رقابت کے گرد گھومتے ہیں وہ ازلی اور ابدی جذبات کی بے پناہ طاقت کا قائل ہے اور بار بار اُسے یہ احساس ہوتا ہے کہ فلسفہ اور تحلیل نفسی کی چکا چوند کے باوجود انسان کی فطرت میں کوئی نمایاں تغیر واقع نہیں ہوا ان گنت صدیوں سے انسان ـــ بے بس اور مجبور انسان اسی سراب کی طرف بڑھ رہا ہے! اسی کرب میں مبتلا ہے جو ابتدائے آفرینش سے آدم زاد کو تڑپاتا رہا ہے۔

"اور بانسری بجتی رہی" جس سے اس مجموعے کی ابتدا ہوتی ہے اس امر کی دلیل ہے کہ زندگی ازل سے نغمہ زن ہے! اور موت اگرچہ اُس کا گلا گھونٹنے کی کئی بار کوشش کر چکی ہے لیکن زندگی کچھ ایسی سخت جان واقع ہوئی ہے۔ کہ موت فاتح ہو کر بھی مفتوح بن کر رہ گئی ہے۔ زندگی کا نغمہ موت کی لاش پر گونجتا ہے! اور زندگی کے مقابلہ میں موت اس حملہ آور کی مانند معلوم ہوتی ہے جو کسی ایسے جادوگر پہ وار کرتی ہے، جس نے جادو کا زرہ بکتر پہن رکھا ہے! اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے راجندر سنگھ بیدی نے ایک جگہ لکھا ہے "اور بانسری بجتی رہی"

ستیارتھی کا ایک بلند پایہ افسانہ ہے جس میں قدرت کی مثبت اور منفی طاقتوں کے درمیان المی کشمکش کو نہایت دلچسپ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ قدرت کی مثبت طاقت یعنی زندگی ہمیشہ اپنا راگ جاری رکھتی ہے کبھی کبھی نغمۂ زندگی کا مغنی قدرت کی منفی طاقت کو جو کہ علامتی طور پر افسانے میں سانپ کی شکل میں نمودار ہوتی ہے مسحور کر دیتا ہے اور سانپ کی نفرت عمیق گہرائیوں میں کھو جاتی ہے لیکن کچھ دیر بعد سانپ کو اپنے زہر کے وجود کا احساس ہوتا ہے وہ زندگی کو موت میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اہیر کو مار کر اُس کا نغمہ ختم کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن زندگی کا نغمہ ہر صورت میں جاری رہتا ہے۔ کیونکہ قدرت کو یہی منظور ہے۔ اور ہوا کے بانسری میں سے گزرنے کے عمل سے نغمہ جاری رہتا ہے[1]۔

"اگلا پڑاؤ" کا ہیرو اگرچہ اگم شام گویا ہے لیکن دراصل وہ آدم ہے جو روزِ ازل سے حوا کا تعاقب کر رہا ہے اور حسن کی زندگی کا المیہ اس سانحہ میں پنہاں ہے کہ حسن جگنو کی طرح ایک بار جھلک دکھا کر زندگی کے اندھیارے میں ہمیشہ کیلئے گم ہو جاتا ہے۔ عشق ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ تک حسن کا تعاقب کرتا ہے لیکن مایوسی ہر پڑاؤ پر اُس کا استقبال کرنے کیلئے موجود ہے۔ اس امر کے باوجود عشق اپنا تعاقب اس اُمید کے سہارے جاری رکھتا ہے کہ شاید اُس کی مراد اگلے پڑاؤ پر بر آئے۔ کاش عشق کو معلوم ہوتا کہ اِس لمبی دوڑ میں کبھی آخری پڑاؤ نہیں آتا۔

"تلافی"، "کمین گاہ"، "بھبنیٹ"، اور "جشن" جنگ کے رنگ میں رنگے ہونے کے باوجود ہمہ گیری کے حامل ہیں "تلافی" اور "کمین گاہ" کا موضوع وہ ازلی اور ابدی جذبہ ہے جو ازل سے ابد تک انسانوں کو تڑپاتا رہا ہے یعنی جذبۂ انتقام۔ وہ خوفناک جذبہ جو بعض حالات کے پیشِ نظر مقدس ترین جذبہ قرار دیا جا سکتا ہے "تلافی" میں ایک ناگا لڑکی کی کھوئی ہوئی عصمت سارے قبیلے کے جذبۂ انتقام کی محرک ثابت ہوتی ہے اور جب تک عصمت کے ڈاکو کے کٹے ہوئے سر پر ناگا دوشیزہ تھوک کر اُسے ٹھوکر نہیں لگاتی اُسے باعصمت ہونے کا احساس نہیں ہوتا "کمین گاہ"

---

[1] راجندر سنگھ بیدی "دیویندر ستیارتھی، ایک عوامی فنکار" شاہکار ماسکی جون ۱۹۴۵ء

ہیں سولہ ہندوستانی سپاہی دشمن کی ناک میں ٹھیٹے دکھائے گئے ہیں 'سپنیا' ان کا رہنما کبھی ایک ماہر سنگتراش تھا مٹی پر
ہیں اس کا نگار خانہ بمباری سے برباد ہو جاتا ہے اور فوج میں نام لکھوا کر وہ فن اور انسانیت کے دشمنوں کے خلاف لڑتا
ہے 'رجمنٹ' جاپانی حملہ آوروں پر ایک گہری طنز ہے جو بدھ کے پیرو ہونے کے باوجود خون اور بارود کی ہولی
کھیلتے ہیں 'دیشن' انسان کی قدامت پسندی اور ماضی پرستی کی دلچسپ مثال ہے۔

'جگنو ہی جگنو' کہنے کو تو افسانہ ہے لیکن دراصل شعر و نغمہ اور خوشبو کی ضیافت ہے۔ اس کی جزئیات
میں چوڑیوں کی جھنکار اور ساغروں کی کھنک ہے۔ نرگس کا کردار رومانی کردار نگاری کا معجزہ ہے شاعر نے
شاید اسی افسانے کی ہیروئن کے متعلق کہا تھا۔

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک　　شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

اور حسن کی ستریاں جگنو ہی تو ہیں جو اپنی چمک دکھا کر حسن اور فن کے شیدائیوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہیں اور جو
تاریک راتوں سے چند لمحوں کیلئے شاعروں اور فنکاروں کو محنت اور سرمایہ کی رزم گاہ سے اٹھا کر ایک نئی دنیا
کی جھلک دکھاتی ہیں۔ صرف ایک جھلک جو 'جگنو' کی روشنی کی طرح خوبصورت اور فانی ہے۔ یہ افسانہ نہیں غزل
ہے جس کا ہر شعر کامیاب ہے۔ اور جس کا مطلع مقطع سے بھی زیادہ حسین ہے۔

'ستلج بپھر بپھرا' میں ان لوگوں کی نفسیات کا تجزیہ کیا گیا ہے جن کے نزدیک ایمہ الہام کا درجہ رکھتا ہے
ہم کی شکست بھی ان خدا کے بندوں کو اپنے اعتقاد سے متزلزل نہیں کر سکتی۔ اور حالانکہ پیر جس نے ستلج
کی بپھرتی ہوئی لہروں کو رام کرنے کا تہیہ کیا تھا طوفان کے تھپیڑوں کی نذر ہو چکا ہے، یہ لوگ اس
کی بے پناہ روحانی طاقت میں شک کو کفر کے مترادف سمجھتے ہیں۔

'جھمکے' کا ہیرو ایک جانگلی عاشق ہے جو محبوبہ کی خاطر قیدِ فرنگ کو سسرال کا گھر سمجھتا ہے اور

چور ہونے کے باوجود اپنا سر فخر سے بلند کرتا ہے جس فنکاری سے ستیارتھی نے ایک چور کے لئے قاری کے ذہن میں ہمدردی پیدا کی ہے، وہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اخلاق سراسر اضافی مسئلہ ہے۔ جانگلی لوگوں کی اخلاقی قدریں ہماری نگاہ میں چاہے نہ جچیں لیکن اگر ان کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو چوری یا ڈاکہ لائقِ تحسین کارنامہ ہے جس کے بغیر نہ جانگلیوں کی پنچایت کسی نوجوان کے سر پر پگڑی باندھتی ہے اور نہ وہ نوجوان کسی جانگلی دوشیزہ کے دل پر حکومت کر سکتا ہے۔

ڈیل ایلیں جیمز جائس اور ورجینا وولف کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ نئی نویلی دلہن زمان و مکان سے بے خبر اپنی ڈولی میں بیٹھی ہوئی ماضی، حال اور مستقبل کے بحرِ بے پایاں میں غوطے لگاتی ہے اور نرم و نازک احساسات کے موتی اور گھونگھے فضا میں اچھالتی ہے۔ نوجوان کہاروں کے ہمراہ ایک بوڑھا کہار بھی شامل ہے جو اپنے تجربات کی بنا پر ڈولی کو ایک جھولتا پل سمجھتا ہے۔ پل، جو میکے اور سسرال کی درمیانی خلیج کو پاٹتا ہے۔

دیتائی کے دنوں میں اور پرانے ہل کسانوں کی زندگی کے مطالعے ہیں۔ پہلے افسانہ میں جاگیرداری کے خلاف بغاوت کرنے والے ہلواہوں کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اگرچہ حکومت کی مدد سے اس بغاوت کو دبا دیا جاتا ہے لیکن یہ امر واضح ہے کہ اب تشدد بھی اپنی پوری قوت سے اس بغاوت کو ختم نہیں کر سکتا۔ دوسرا افسانہ جنگ سے لوٹے ہوئے سکھ سپاہی کے گرد گھومتا ہے جو گاؤں کی فرسودہ روایات کے کھنڈرات پر نئی تعمیر کا قصد کر چکا ہے لیکن پہلے ہی روز وہ پھر سے پرانے ہلوں کی برادری میں شامل ہو جاتا ہے۔

ستیارتھی کا طرزِ بیان اچھوتا ہے۔ اس کے فقروں پر مصرعوں کا گمان ہوتا ہے یعنی ایسا معلوم

ہوتا ہے جیسے وہ مصرعے ہوں یا ہو سکتے ہوں۔ سبک خرامی، نرم روئی، مٹھاس اس کے اسلوبِ نگارش کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کی تشبیہوں میں شہد کی حلاوت اور گنگا جل کی پاکیزگی ہے۔ اُسے زندگی کے اڑتے ہوئے حسین لمحوں کو اپنی املا اور انشا کے جال میں پھانسنے کا فن آتا ہے۔ قدرت نے اسے غضب کی قوتِ بیانیہ عطا کی ہے۔ وہ لمحاتی زندگی کا عکاس ہے۔ معمولی سے معمولی تجربہ اُس کے تخیل سے چھن کر نبات النعش سے خوبصورت اور ثریا سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں لوک گیتوں کے ٹکڑوں اور ہندو دیومالا کی داستانوں کو خوبصورت نگینوں کی طرح جڑتا ہے۔ کچھ اس انداز سے کہ اُن کی آب و تاب سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

ستیارتھی کا فن اُس کی شخصیت سے بھی زیادہ دلآویز اور دل پذیر ہے۔

اے۔ وی کالج۔ لاہور
جنوری ۱۹۴۶ء

کنہیا لال کپور

....اور بنسری بجتی رہی

برگد سے کتنی ہی ڈاڑھیاں لٹک رہی تھیں ——— بل کھاتے بھیانک سانپوں کی طرح!

گھنے، سایہ دار درخت نے اس سنسان جگہ کو سڑک سے چھپا رکھا تھا کہیں کہیں گھاس اُگ رہی تھی۔ جیسے جوانی سے ذرا پہلے کسی نوجوان کی مسیں بھیگ رہی ہوں۔ ایک طرف ہموار ڈھلوان چلی گئی تھی اور دوسری طرف ایک ٹیکرا تھا۔ جو ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کنواری دھرتی کا اُبھرا ہوا سینہ ہو۔

پرے کھیتوں میں دھوپ تھی، ہنسی تھی اور سرور کی لہریں۔ فصل کے دانہ دانہ میں دھرتی کا دل دھڑکتا تھا اور کھیتوں کی مٹی سے اناج کی سوندھی

سوندھی خوشبو آتی تھی، جیسے گائے کے سانس میں سے دودھ کی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔ اور شرمیلی دلہن کی طرح زندگی دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھی۔

دور ــــ تا حدِ نگاہ سبزہ بچھا ہوا تھا اور آسمان پر سیلانی پرندوں کی قطاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ اُن کی خانہ بدوش طبیعت اُن کے بازوؤں میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والی رو پیدا کرتی رہتی۔ آدمی انہیں دیکھتا اور اپنی زندگی کے لیے نئے تاثرات حاصل کرتا۔ کس نے سکھائی یہ پرواز ان آزاد بے فکر پرندوں کو؟ سینکڑوں نہیں ہزاروں میلوں سے بلند برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں کو پار کرتے وہ میدانوں کی طرف نکل آتے ہیں؟ سال کے سال مقررہ موسم میں کس نے سکھایا آدمی کو ہل چلانا اور دھرتی سے اناج کے جواہر پیدا کرنا۔ سال بسال ہر فصل پر کھیتوں کی کوکھ سے آدمی کی خوراک کا جنم ہوتا ہے۔ دنیا کی وسیع گود میں زندگی کھیلتی رہتی ہے ــــ متواتر، اٹوٹ کھلنڈرے پن سے! کون جانے اس کا آغاز کیسے ہوا اور کب؟ اور کیا یہ کبھی ختم بھی ہوگی؟

اُس سنسان ٹیکرے پر ایک اہیر بنسری بجا رہا تھا۔ گائیوں نے چرنا چھوڑ دیا بنسری کے جادو بھرے نغمے نے اُن پر ایک وجدانی کیفیت طاری کر دی۔ ڈھلوان پر سے وہ اوپر چڑھ آئیں۔ جنگل کے ہرن اور مور بھی دوڑے آئے اور مست ہو کر بنسری کا نغمہ سننے لگے۔

سنسار اور اُس کی دلچسپیوں سے بے خبر ہو کر اہیر لگاتار اپنا نغمہ الاپ رہا

تھا۔ بنسری میں اُس نے اپنا دل ڈال دیا تھا۔ جیسے وہ بانس کا بنا ہوا آلۂ موسیقی نہ تھا بلکہ ایک دوشیزہ تھی جو اپنے محبوب کے عمیق ترین احساسات کی ترجمانی کر رہی تھی جب سے اُس نے اپنے گانے میں ایک حقیقی پناہ پالی تھی۔ اُسے اپنی بنسری سے ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا لگاؤ ہو گیا تھا۔ بار بار وہ سوچتا کہ بنسری اس کی دلہن ہے جو اس کے ہونٹوں کے لمس کے لئے ترستی رہتی ہے۔

گائیں مست ہو رہی تھیں، مور بھی اور ہرن بھی۔ جیسے ان کی کوئی مدت کی پیاس بجھ رہی ہو، کوئی مدت کی بھوک مٹ رہی ہو۔ یہ کسی نئی زندگی کا نغمہ تھا اس کی ایک ایک تان پر وہ جھوم رہے تھے۔ یہ نغمہ شاید زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ زندگی ایک ہے، سدا اس کا دور جاری رہتا ہے۔

اور پھر آسمان کے پرندے بھی اس ٹیکرے پر اتر آئے۔ یہ دوستی کا نغمہ تھا۔ اس کی ہر لے عشق، حسن اور شباب سے مل کر بنی تھی۔ بڑا میٹھا میٹھا رس تھا۔ بیچ بیچ میں ایک درد سا بھی ـــــ ایک ابدی درد! کھیتوں کا ساراسنگیت درختوں کی سب سرگوشیاں، جھرنوں اور دریاؤں کے بہتے پانی کے سارے بول تیز ہوا کی سنسناہٹ۔ گائیوں کے دلوں کی دھڑکن۔ تیز سانس اور سرسرے کی آواز جو ان کے دودھ دوہے جانے سے پیدا ہوتی ہے ـــــ یہ سب کچھ شاید اس نغمہ میں سما گیا تھا۔ اور پھر زہری سانپ بھی اس ٹیکرے پر چڑھ آیا تھا۔

سانپ کی خصلت ہے کاٹنا۔ مگر وہ تو پیار کا نغمہ تھا۔ سنتے سنتے وہ کہئی

بار چونک اُٹھا۔ اس کے کھٹور سر میں زہر حرکت کرنے لگا۔ لیکن اُسے اپنے جسم میں ایک جھرجھری سی محسوس ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے —— نغمہ نے اس کے زہر پر فتح پالی تھی۔

نغمہ کی تانیں فضا میں بکھر رہی تھیں۔ چاروں طرف ایک پُرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ زندگی کی ساری نفرت کون جانے کن گہرائیوں میں گم ہو چکی تھی پُروا ہوا بھی تھم گئی —— یہ شاید اس کی اطاعت کا ثبوت تھا۔

سانپ کا برہنہ جسم چمک رہا تھا۔ بھن پھیلا کر وہ رقص کر رہا تھا۔ وہی ابدی رقص اس وقت وہ اپنے زہر سے بے خبر تھا۔ سانپ کا یہ رقص کوئی مصنوعی رقص نہ تھا۔ یہ پیار کے نغمہ سے پیدا ہوا تھا۔ سانپ کی آنکھوں سے بدستور آنسو گر رہے تھے۔ وہ بھی دل رکھتا تھا، صرف زہر ہی نہیں۔ اور وہ دل کا درد سمجھتا تھا —— زندگی کی رگ رگ میں حرکت کرنے والا لطیف درد!

دور پُوربی افق پر ایک کالی بدلی چھا رہی تھی۔ پرے کھیت سے ایک کسان کی دلہن گا اٹھی "اری او رکالی بدلی! تم میری دھرم کی بہن ہو۔ دیکھو، پیاری بدلی، پہلے میرے باپ کے کھیتوں پر برسیو، اور پھر سسرال کے کھیتوں پر! چوکنا مت، بہن بدلی! جیسے میں کہتی ہوں، ویسے ہی کرنا پیاری!"

اور اہیر نے اپنے لبوں سے بنسری ہٹالی۔ نغمہ بند ہو گیا۔ اُس کے کان کھیتوں سے آتے ہوئے گیت کی جانب متوجہ ہو گئے۔ گائیں ٹیکرے سے نیچے اُتر رہی تھیں۔

ہرن بھی جا رہے تھے، اور مور بھی۔ پرندوں کو بھی آسمان کی بلندیاں یاد آ گئی تھیں۔

زہری سانپ بدستور پھن پھیلائے رقص کر رہا تھا۔ اہیر ڈرا نہیں۔ وہ مسکرایا۔ یہ اُس کے نغمہ کی دلکشی کا ثبوت تھا۔ وہ خوش تھا۔

اور کسان دُلہن نے پھر گایا "نیم پر، ہری ہری نیم پر میری بہن جھولا جھول رہی تھی ہائے! میری ماں رو پڑی۔ میں بھی رو پڑی۔ بہن کو کالے ناگ نے ڈس لیا تھا"

کس ناگ نے ڈس لیا تھا جھولا جھولتی کنواری کو؟ کیا یہی سانپ تھا۔ وہ ناگ، جو اہیر کے پاس پھن پھیلائے جھوم رہا تھا؟ اسے تو رونا آتا تھا۔ اب تک اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور جب کوئی روتا ہے اُس کا زہر مر جاتا ہے!

زہری سانپ ٹیکرے سے نیچے اُتر رہا تھا۔

اُس کے بند بند میں ایک غیر معمولی تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ جذبات کی رو میں وہ بہت دیر تک رقص کرتا رہا تھا۔ ضرورت سے زیادہ۔

یہ نغمہ نہ تھا، ایک منتر تھا۔ ورنہ وہ وہاں کیوں جاتا؟

اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ لہو پہلی چال سے چلنے لگا۔ وہ پھر وہی پہلا سانپ تھا جس کی خصلت ہے کاٹنا۔ اور اس کے تاثرات کی خبر صرف اسی کو ہی تھی۔

جب وہ کھیت کی مینڈھ کے پاس پہنچا تو اُس نے ساپن کی لاش بدستور پڑی دیکھی۔ اب وہ بدبو دار ہو رہی تھی۔ سانپ کا دل بے چین ہو گیا۔ لاش کے گرد اس نے پانچ چکر کاٹے اور پھر ٹکٹکی لگا کر مردہ ساپن کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا اُس کے سر میں زہر پھر جاگ اٹھا۔

یہ ساپن اُس کی محبوبہ بنی، اُس کے پیچھے پیچھے چلا کرتی تھی۔ چاندنی راتوں کے کتنے ہی کیف آور لمحے دونوں نے بارہا ایک ساتھ گذارے تھے۔ اُس کی صحبت میں زندگی کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی، کتنی ملائم اور چمک دار —— ساپن کے جسم کی طرح، اور خود اُس کے اپنے جسم کی طرح جب کہ کینچلی ابھی ابھی اتار کر پھینکی گئی ہو! کتنی ہی بار اُس نے اپنی زبان ساپن کی زبان پر رکھ کر اُسے اپنی دائمی محبت کا یقین دلایا تھا۔ تب وہ کیا جانتا تھا کہ ایک دن اُسے یوں اپنی محبوبہ کے بے حس جسم پر آنسو گرانے ہوں گے۔

اس کا زہر اور بھی بھڑک اُٹھا۔ اپنا پھن لاش کے نزدیک لا کر اُس نے اُسے پھر سونگھا۔ اور اس کی آنکھوں میں انتقام کی آگ جلنے لگی۔

فضا میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پُوربی ہوا کے لمس سے غصہ ور سانپ کا بند بند ایک نئی قوت محسوس کرنے لگا۔

کسی شاہزادے کی چاند رانی سے سانپ کی محبوبہ کیا کچھ کم تھی؟ اس چاند رانی کو کوئی مار ڈالتا تو قاتل کو پکڑنے کے لئے حکومت ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی

اور اگر سانپ بھی اپنی محبوبہ کے قاتل کا دشمن بن گیا تو کونسی بڑی بات ہو گئی؟

پہلے بھی ایک دن اہیر نے بنسری پہ اپنا نغمہ چھیڑا تھا۔ اور سانپ اور سانپن نغمہ کی آواز سے مست ہو کر اس ٹیکرے کی طرف چل پڑے تھے، جہاں اہیر اپنی لے کی نرم نرم جھکیوں سے گائیوں کا من رجھا رہا تھا۔

اور جب سانپ اور سانپن پگڈنڈی کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ کسی شریر راہی نے اپنی پرانی عادت کے مطابق سانپن کو نشانہ بنا دیا تھا سانپ کافی آگے آگے جا رہا تھا، ورنہ اگر اُسے اُسی وقت اپنی محبوبہ پہ کئے گئے اس ظلم کا پتہ چل جاتا تو وہ اُسی وقت اس ظالم راہی کو موت کی نیند سلا دیتا۔ اب نہ وہ راہی کہاں چلا گیا تھا، پچھلے غصہ کی یاد نے انتقام کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔

پہلے سانپ نے سمجھا کہ سانپن کی موت کی ذمہ داری اہیر یا اس کے نغمہ پر کسی طرح عاید نہیں ہوتی! اور جب سے اس نے اُس کی سب سے زیادہ دودھ دینے والی گائے کی پچھلی ٹانگوں میں لپٹ کر اُس کا میٹھا میٹھا دودھ پینا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کی یاد کچھ کچھ فراموش کر بیٹھا تھا۔

مگر سانپن کی لاش دیکھ کر سانپ کے لہو کی ایک ایک بوند نفرت کی آئینہ دار بن گئی۔ اور وہ سب شانتی جو اُسے بنسری کا نغمہ سن کر حاصل ہوتی تھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔

وہ راہی اب نہیں ملتا تو نہ ملے۔ وہ اس اہیر کا خاتمہ کر ڈالے گا۔ اور

اُس کے نغمہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیگا۔ نہ اُس دن اہیر نے نغمہ چھیڑا ہوتا نہ وہ اپنی محبوبہ سمیت ٹیکرے کی جانب چل پڑتا! اور وہ راہی جس نے سانپن پر پتھر پھینکا، ضرور اس اہیر کا بھائی بند ہوگا ——— آدم کا بیٹا، سانپوں کا ابدی دشمن!

کسی دوسری سانپن سے وہ آسانی سے پیار کر سکتا تھا اور اپنی نسل کو آگے بڑھانے میں اُسے کیا تکلیف ہو سکتی تھی آدمی بھی ایک عورت کے مرجانے پر دوسری عورت کا دم بھرنے لگتا ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ وہ انتقام کے جذبہ سے منہ موڑ لیتا۔

آخر زہر کا مفہوم کیا ہے؟ مارنا! انتقام لینا! زہر بنا ہی ہے مارنے کے لئے آدمی کو سانپ سے ڈرنا چاہیئے۔ سانپ کے انتقام سے۔ زہر سانپ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور جب تک وہ زندہ رہتا ہے اُس کا زہر بھی مرتا نہیں۔ جھوٹے امرت سے تو سانپ کا زہر ہی ہزار بار سچا ہے۔ اس کی زبان ناپاک ہے تو ناپاک ہی سہی مگر کیا وہ امرت کی ڈینگیں مارنے والوں سے انتقام لینا بھی چھوڑ سکتا ہے؟ اُس کے سر میں زہر سوتا رہتا ہے جب تک کہ کوئی اسے جگا نہیں دیتا۔

زہری سانپ بہت جلد اہیر کے ہاتھ سے بنسری گرا دینا چاہتا تھا ہمیشہ کے لیے۔ تاکہ پھر کبھی اُس کا نغمہ فضا میں نہ گونج اٹھے اور اسے اس کے ارادے سے کون روک سکتا تھا؟

پچھم کی طرف قوسِ قزح کمان کی طرح تنی ہوئی تھی۔

سانپ ٹیکرے کے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اہیر سو رہا ہے۔ بڑا

اچھا موقع تھا۔ دھیرے دھیرے وہ اس کے قریب جا پہنچا۔ اس نے چھتری کی طرح پھن پھیلا لیا! اہیر کے پاؤں کا بوسہ لے لیا۔

اہیر پھر کبھی نہ جاگا۔ گائیں بدستور ٹیکرے کے قریب چر رہی تھیں جہاں ہری ہری گھاس زندگی کا کوئی خاموش نغمہ سنتی ہوئی تیزی سے اُگ رہی تھی۔

زہری سانپ نے اہیر کو ایسے غصہ سے کاٹا تھا کہ وہ درد کے ایک شدید احساس سے تڑپا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلی ناک سے خون بہنے لگا۔ اور وہ ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

سانپ خوش تھا۔ اُس نے اپنے ابدی دشمن کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اُوپر آسمان پر چاند نمودار ہو رہا تھا۔ سانپ نے چاند کی جانب دیکھا اور اُس کے من میں بسی ہوئی خود نمائی بول اُٹھی۔ آدمی تو آدمی ضرورت پڑے تو وہ چاند کو بھی ڈس سکتا ہے۔ سانپن کی یاد اب اُسے رُلاتی نہ تھی۔ وہ تو شہید ہو گئی۔ اور اس نے انتقام لے کر اپنی نسل کی لاج رکھ لی۔ وہ شیطان بن گیا تھا۔

زہر کہتا ہے۔ او زندگی! مجھ سے ڈر۔ کون جانے زہر کا آغاز کیسے ہوا اور کیا کبھی زہر ختم بھی ہو جائے گا؟ مگر زندگی کا سانس ہمیشہ جاری رہنا ہے

جیون تو امر ہے۔

پوربی ہوا چل رہی تھی اور وہ مردہ اہیر کے نیچے پڑی ہوئی بنسری میں سے گذر کر نغمہ پیدا کر رہی تھی مگر وہ اداس تھی۔ اور نغمہ کی غمگینی اور دلسوزی فضا کی وسعتوں میں بکھر رہی تھی۔

برگد کی ڈاڑھیاں برابر لٹک رہی تھیں —— بل کھاتے بھیانک سانپوں کی طرح! پوربی ہوا کے جھونکے ڈاڑھیوں کو ہلا رہے تھے اور ان کی سرگوشیاں بھی غمگین اور دل سوز ہو رہی تھیں۔

نغمہ گونج رہا تھا۔ سانپ حیران تھا۔ کون بنسری بجا رہا ہے؟ اہیر تو مر گیا۔ وہ چاروں طرف حیران نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ بار بار پھن پھیلاتا تھا۔ یہ نغمہ ضرور بند ہو جانا چاہیئے کسے سوجھی ہے یہ شرارت؟ کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ میں اس کا بھی اسی طرح بوسہ لے سکتا ہوں —— وہی بوسہ، جس نے اہیر کو موت کے منہ میں دھکیل دیا؟

کس نے پھونکی زندگی میں اتنی خود نمائی؟ شروع میں یہ آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہے۔ جیسے درختوں پر بور نمودار ہوتا ہے کیا امرت میں بھی اتنی ہی خود نمائی ہوتی ہے، جتنی کہ زہر میں؟

زہری سانپ نے سمجھا کہ اہیر کے سب بھائی بند —— آدم کے بیٹے بنسریاں بجا رہے ہیں۔ اُس کے کالے چمکدار جسم کا بند بند دکھنے لگا۔ نہیں وہ ڈر یگا

نہیں۔ وہ مقابلہ سے بھاگے گا نہیں۔ اُس کا زہر اور بھی کڑوا ہو رہا تھا جیسے بسنت رُت میں شہد اور بھی خوشبو دار بن جاتا ہے اور میٹھا بھی۔

مگر وہ اکیلا ہے اور آدم کے بیٹے لاتعداد۔ مقابلہ سخت ہے۔ تو کیا ہوا وہ ڈٹ کر لڑے گا۔۔۔۔ مر جائے گا یا سب کو مار ڈالے گا۔۔۔۔ پہلے سب ایہریں کو، اور پھر آدم کے باقی بیٹوں کو! اور اگر سب کے ہاتھوں سے بنسریاں نہ گرا دیں، نغمہ نہ بند کر دیا، تو اس کا نام ناگ نہیں۔

وقت گذر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے ختم ہونے والے پہاڑی سایوں کی طرح۔ برگد کا درخت وہیں کھڑا تھا اور ٹیکرا بھی۔ نغمہ بدستور جاری رہا۔ سانپ کے ذہن میں وقت کے لمبے سائے اپنا عکس ڈالتے رہے۔

اُس وقت خدا کا انصاف کہاں تک تھا جب ایک شریر راہی نے پگڈنڈی کے کنارے سانپن کا سر پتھر مار کر توڑ ڈالا تھا۔ اب اگر خدا بھی اُسے انتقام لینے سے منع کرے گا تو وہ ایک نہ سنے گا۔ خدا ہو گا اپنے گھر میں۔ وہ بھی بے انصاف ہو سکتا ہے! سانپ پر اب اس کا حکم نہیں چلنے کا۔ وہ سانپ بھی ہے اور شیطان بھی! اگر خدا میں ذرا بھی طاقت ہے تو وہ اس نغمہ کو ہی کیوں نہیں بند کر دیتا؟ خدا بھی غریبوں اور کمزوروں کو ڈراتا ہے۔ اکھڑ اور نڈر کے سامنے اُس کی بھی کوئی پیش نہیں جاتی! اور سانپ ضرور کوئی ایسی ترکیب نکال لے گا جس سے وہ آدمی تو آدمی خدا اور آدمی کی مشترکہ طاقت

کا بھی مقابلہ کر سکے۔ اکیلا آدمی تو ہرگز اس کے سامنے کھڑا ہونے کی تاب نہ لا سکے گا۔

ایک دن سانپ سو کر اٹھا تو وہ خوشی سے ناچنے لگا۔ مگر پھر بہت جلد اس کی خوشی سنجیدگی میں بدل گئی۔ جیسے الہام کے بعد آدمی کی کایا پلٹ جاتی ہے۔

پاتال کے سارے سانپ دھرتی پر آ گئے۔ زہری سانپ یہ جانتا تھا کہ پاتال کے ان سب سانپوں کی طاقت سے وہ ایک ایک آدمی کی بنسری نہ گرا سکے گا۔ مگر وہ خوش تھا کہ وہ اس کی دعوت پا کر بغیر کسی پس و پیش کے بھاگے چلے آئے تھے۔ وہ ان سب سانپوں کو اپنی طرح طاقت ور بنا دیگا۔

پچھم کی طرف قوسِ قزح تنی ہوئی تھی۔ آدم کے بیٹے اسے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ یہ کسی بڑھیا کا جھولا ہے۔ جیسا کہ وہ اپنی بڑھیا دادی سے سنتے آئے تھے مگر انہیں یہ بھی تو یاد تھا کہ جہاں سے یہ جھولا اوپر اٹھتا دکھائی دیتا وہاں افق کے قریب ہی زہری سانپ کا بل بھی ہے۔ سانپ سے بچیو۔ بچہ دادی اماں اور ماں کی یہ نصیحت آدم کے ہر بیٹے کو یاد تھی۔

زہری سانپ نے کھانے میں کسی طرح اپنے زہر کا بیشتر حصہ ملا دیا۔ اور یہ کھانا کھانے کے بعد سب سانپ اسی کی طرح مہلک بن گئے۔

رو رو کر اس نے اپنی داستانِ الم سب سانپوں کو سنائی اور انسان

اور اس کے نغمہ کے ابدی دشمن بن جانے کی تلقین کی۔

سب سانپ رضامند ہو گئے۔ باہمی مشورہ سے انہوں نے ایک پنج سالہ پروگرام مرتب کیا جس میں وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کریں گے اور زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو ڈسیں گے۔

اِدھر اولادِ آدم نے بھی سانپوں کے اس پروگرام کا بھید پا لیا۔ انہوں نے اپنی عورتوں کے مشورہ سے زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ان کی نسل قائم رہے اور جہاں تک بس چلے گا وہ اپنی لاٹھیاں برسا کر سانپوں کے سر کچلتے رہیں گے ـــــ انہیں کبھی دودھ نہ پلائیں گے۔

سانپ اور سنپولئے انسان کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنے کی سعی کرتے رہے۔

گھنے سایہ دار برگد نے اُس سنسان جگہ کو اب بھی سڑک سے چھپا رکھا تھا۔ کہیں کہیں گھاس اُگ رہی تھی۔ جیسے جوانی سے ذرا پہلے کسی نوجوان کی مسیں بھیگ رہی ہوں۔ ایک طرف ہموار ڈھلوان چلی گئی تھی اور دوسری طرف ایک ٹیکرا تھا۔ جیسے وہ کنواری دھرتی کا ابھرا ہوا سینہ ہو ـــــ اور بنسری بجتی رہی!

اگلا پڑاؤ

خانہ بدوش رقاصہ کی پائل کی جھنکار اُس کی روح کی گہرائیوں میں جھنک رہی تھی۔ یکے پر بیٹھے بیٹھے اُس نے سڑک کا جائزہ لیا اور پھر اس رقاصہ کا تجزیہ کرنے لگا۔ وہ ابھی انجان ہے۔ جانے کس سانچے میں ڈھالی گئی تھی یہ تتلی۔ اُس کا نام 'الکا' نہ ہوتا تو شاید مجھے اُس کا رقص پسند نہ آتا۔ میں اس کا رفیقِ کار بن جاؤں تو اُس کا فن چمک اٹھے۔ اُس نے اپنا فن اپنی ماں سے دودھ کے ساتھ حاصل کیا ہوگا۔ اُس کا بھائی طبلہ بجاتا ہے اور بڑھیا ماں جو اپنے زمانے میں اچھی نرتکی رہی ہوگی، جھانجھ بجایا کرتی ہے۔ اور وہ نندن مہاراج؟— اُس کا ہارمونیم ماسٹر تو اُسے سلجھے ہوئے مذاق کی چیزیں بتانے سے قاصر ہے۔ کاش

وہ نندن مہاراج کو چھٹی دے دیتی! وہ ہمیشہ میرے رباب پر ناچتی۔

ایک پڑاؤ ——— دوسرا پڑاؤ ——— اور اب وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ ایک ہی جست میں تیسرے پڑاؤ پر جا پہنچے۔ یکے والے نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ اب وہ لوگ وہاں ضرور مل جائیں گے۔

وہ یکے والے پر اپنا رنگ جمانے لگا ——— چھ راگ ہیں۔ اور چھتیس راگنیاں پھر ان راگنیوں سے نکلی ہوئی اور راگنیاں بھی ہیں۔ ان راگنیوں کے کئی کئی بیٹے اور کئی کئی پوتے ہیں۔ راگوں کا خاندان بہت پرانا ہے سمندر ہے سمندر۔ کون تھاہ پائے گا بھلا۔ ہر راگ کی اپنی تصویر ہے، اپنی تاثیر ہے۔ ارے میاں، تم نے بھیرویں تو سنا ہو گا۔ اسے سن کر تو جنگل کے ہرن بھاگے چلے آتے ہیں۔ تان سین نے دیپک گایا تھا۔ اُس کی روح تک اٹھی تھی۔ اور تانی نے میگھ گا کر اسے پھر جیون بخشا تھا۔ ارے میاں میگھ کے اثر سے تو بادل گھر آتے ہیں۔ اور بارش ہونے لگتی ہے۔ دیپک گا کر تو دیئے بھی جلائے جا سکتے ہیں۔ آج کل تو ایسے راگی نظر نہیں آتے۔

لیکن میاں جی، تلاش کرو تو مل بھی سکتے ہیں۔"

سنگیت کے علاوہ وہ نرت سے متعلق بھی کچھ بتانا چاہتا تھا۔ لیکن جھٹ النکا کی تصویر اس کے سامنے آگئی اور باتوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے النکا پوچھنا چاہتی ہو کہ تمہیں پیلو میں بہار کے سُر اچھے لگتے ہیں یا نہیں۔ ارے بھولی۔ وہ کس کو اچھے نہیں لگتے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے دو عطر ایک ہی

شیشی میں بھر دیئے جائیں۔ من ہی من میں اس نے الکا کو بتایا کہ وہ کئی بار سات رنگ کے شربت پی جاتا ہے اور اُس کے سینے میں قوس قزح سی بن جاتی ہے۔ اُسی طرح جیسے وہ اپنے ناچ میں ساتوں رنگ بھرتی چلی جاتی ہے وہ اُسے یہ بھی سمجھا چکا تھا کہ نغمے کا تعلق کانوں ہی سے نہیں ہوتا۔ اسے ہم چھو بھی سکتے ہیں۔ چکھ بھی سکتے ہیں اور چاہیں تو سونگھ بھی سکتے ہیں۔ اور جیسے ان سب باتوں کے جواب میں وہ کہہ اٹھی ـــــ ماسٹر جی، نندن مہاراج نے تو کبھی ایسے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔

یکے والے نے اُس کے رباب کی طرف گھورتے ہوئے کہا: "آپ بھی کوئی بیجو باورا ہونگے"

رادھے شیام نے جیسے خواب سے چونک کر یکے والے کی طرف دیکھا اسے خوشی ہوئی کہ یہ معمولی دیہاتی بھی بیجو باورے کی کہانی جانتا ہے۔ وہ اُسے بتانا چاہتا تھا کہ بیجو باورا آج بھی زندہ ہے۔ وِدیا کا بیج ناش تو نہیں ہوتا۔ ہاں بھائی، آج بھی بیجو باورے اور تان سین میں مقابلہ ہو سکتا ہے اور آج بھی تان سین ہی کو منہ کی کھانی پڑے گی۔

یکے والا پھر بولا "کیوں جی، جب وہ چھوکری ناچتی ہوگی تو اُس کے بالوں کی لٹیں اڑ اڑ کر گالوں کو چھونے لگتی ہوں گی"

رادھے شیام نے نہ جانے کیا سوچ کر کہہ دیا: "کل رات تم بھی الکا کا ناچ

دیکھتے تو یکہ چلانا چھوڑ کر عمر بھر اسی کے پیچھے گھومتے رہتے۔"

یکّے والے نے للچائی ہوئی آواز میں کہا: "آج کل سا ہے، خوب چمکتے ہیں اور ان لوگوں کی تو چاندی ہے۔"

رادھے شیام چاہتا تھا کہ یکّے والے کو ڈانٹ کر کہے کہ بس میاں تم کیا جانو الکا کیسے کیسے ناچ ناچتی ہے۔ لیکن اس نے کچھ رُک کر جواب دیا، "ہاں ہاں، میاں جی، تم سب ٹھیک کہتے ہو۔"

باتوں کا تسلسل پھر ٹوٹ گیا۔ رادھے شیام سوچنے لگا کہ اس کے آبنوسی رنگ سے ہر اک کو نفرت ہے اور اُس کے بھدّے خدوخال ہمیشہ اس کی کامیابی میں سدِّ راہ رہے ہیں۔ اُس وقت اُسے اپنی مینا یاد آنے لگی۔ وہ سکول سے لوٹتا تو مینا چہک اٹھتی، جیسے کہہ رہی ہو—— بھلے آئے، ماسٹر جی، صبح سے رباب سننے کو جی چاہ رہا ہے۔ ذرا دو تار چھیڑ دو۔ پھر اُسے اپنی پالتو بلّی کی یاد آئی جو اس کے پاؤں سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ مینا کیا سوچتی ہوگی؟ بلّی اداس سُروں میں میاؤں میاؤں کرتی پھرتی ہوگی؟ اب میں کبھی نہیں لوٹوں گا۔ لڑکے تو خوش ہوں گے کہ ایک ظالم کے پنجے سے چھٹکارا ملا۔ لیکن مینا جانتی ہے کہ میں دراصل انہیں کیوں پیٹتا تھا اور پھر جیسے چونک کر اُس نے یکّے والے کی طرف دیکھا جو گھوڑی کو دوڑائے چلا جا رہا تھا وہ اُسے بتا دینا چاہتا تھا کہ جب الکا ناچتی ہے تو اس کا انگ انگ جھنجھنا اٹھتا ہے۔

آج کل ستارے خوب چمکتے ہیں، اس نے دل ہی دل میں کہا، لیکن مجھے کون اپنی لڑکی دے گا؟ میری عمر کے لوگ تو پانچ پانچ بچوں کے باپ ہیں۔ میرے کشکول میں کسی بھلے آدمی نے اپنی لڑکی کی بھیک ڈالنا پسند نہیں کی۔ اب اگر میرا رنگ آبنوسی ہے تو میرا کیا دوش ہے؟ میں شکل و شباہت سے حبشی معلوم ہوتا ہوں تو اس میں میری خطا؟ مینا جانتی ہے کہ مجھے پے در پے ناکامیاں ہوئی ہیں۔ اور اسی ناکامی کی رو میں، میں لڑکوں کو پیٹتا ہوں۔ اُس سے باتیں کرتے ہوئے بیوی کی کمی کو پورا کر لیتا ہوں۔ جب کبھی مینا کسی تیکھے سُر میں چہک اٹھتی۔ تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کہہ رہی ہو— ماسٹر جی، میں جانتی ہوں کہ تمہارے سپنے بیچ ہی سے ٹوٹ چکے ہیں اور تم رباب بجا کر خود کو یقین دلانا چاہتے ہو کہ نغمے کی دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں .... ہو ہو ہو اُس نے ایک پاگل کی طرح ہنستے ہوئے یکّے والے کا بازو کھینچ کر کہا: "وہ تمہارا خیال سولہ آنے درست ہے، میاں یکے والے! آج کل ستارے واقعی خوب چمکتے ہیں!"

اُس کے ذہن میں گذشتہ شب کو محفلِ رقص و سرود کا ایک ایک نقش ابھرنے لگا۔ گیس کی روشنی میں الکا کے چہرے پر معصومانہ شوخی برس رہی تھی۔ اُس کا تھرکتا ہوا انگ انگ اُس کے ذہن میں عجیب قسم کی ہیجانی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ جب وہ سنہری انگیا اور قوسِ قزحی لہنگا پہنے اور مینوں کے دوپٹے سے گھونگھٹ کاڑھے دلہنیا کا ناچ ناچنے لگی تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی اپسرا دھرتی پر آ کر راستہ بھول گئی ہو۔ اور جب الکا نے ہارمونیم کی گت پر اپنا دل پسند نغمہ الاپنا شروع کیا—

"اب تو نبھایاں سرے گی، بانہہ گہے کی لاج!

تو اُسے ہارمونیم میں وہ پرواز نظر نہ آئی جو ناچ کو عروج پہ لے جا سکتی۔ جانے کس جذبے کے تحت وہ اپنا رباب اٹھا لایا تھا اور نندن مہاراج کی بغل میں آ بیٹھا تھا۔ لیکن ہارمونیم اور رباب ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے۔ نندن مہاراج نے ہارمونیم بند کر دیا۔ الکا بھی ناچتے ناچتے رُک گئی۔ معلوم ہوتا تھا خلاء پڑ گیا۔ لیکن اگلے ہی پل پھر پائل چھنک اُٹھی۔ الکا نے وہی گیت پھر سے گانا شروع کیا۔

اب تو نبھایاں سرے گی، بانہہ گہے کی لاج!

اُس وقت اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس کے سامنے نہ بینا تھی نہ بلّی۔ وہ صرف الکا کو دیکھ سکتا تھا .... وہ گاتے گاتے ناچ رہی تھی — چھن چھن — چھنا چھن چھن — چھن چھن چھن — اور ناچتے ناچتے گا رہی تھی۔

اونچا نیچا محل پیا کا، مہانسوں چڑھیو نہ جائے!

اور جیسے اِس نغمے کے جادو سے اُس کا چہرہ پگھل کر کسی نئے سانچے میں ڈھل گیا ہو۔ اور اب اس پہ کسی کو حبشی کا شُبہ نہ ہو سکتا ہو۔ جیسے برف اور انگارے کا میل ہو جائے، جیسے بلمپت اور دُرت میں سمجھوتہ ہو جائے۔ اُس کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہ چاہنے لگا تھا کہ اٹھ کر الکا کے ساتھ ناچنے لگے۔ رقص جاری تھا جیسے پورنماشی سے پہلے ہی پورنماشی کا چاند جھک کر زمین کا بوسہ لے رہا ہو — ازلی و ابدی چاند جو حیات و ممات کی آنکھ مچولی پہ بھی جان سے قربان ہو سکتا تھا

جانے الکا کی کیا چیز گر پڑی تھی۔ جسے ڈھونڈنے کے لئے وہ سو سو چکر کاٹ رہی تھی ہوا میں ناچ کی خوشبو بسی ہوئی تھی جیسے چمپا اور چمبیلی کھل اٹھے ہوں۔

—— اُس وقت —— رباب بجاتے بجاتے اس نے سوچا تھا۔ کہ الکا کے جسم پر پہلے ہی نندن مہاراج کا قبضہ ہو چکا ہو۔ لیکن آج اس کی روح مجھے مل گئی۔ کہاں ہارمونیم، کہاں رباب۔ ایک سلجھی ہوئی خانہ بدوش رقاصہ شکستہ ہارمونیم کی گت پر ناچے یہ تو ذلت ہے، اب تک وہ ضرور ایک شدید ذہنی الجھن میں پھنسی رہی ہو گی لے جاؤ اپنا ہارمونیم، نندن مہاراج! اب تمہارا ہارمونیم یہاں نہیں چلے گا۔ اب یہاں رباب بجے گا! اور رباب کی تال پر الکا گا رہی تھی۔

شولی اوپر سیج ہماری
کس بدھ سونا ہوئے!
گگن منڈل پر سیج پیا کی
کس بدھ ملنا ہوئے!
ہے ری میں تو پریم دیوانی
میرو درد نہ جانے کوئے!

اُسے یوں معلوم ہوا کہ اس کے رباب کے سوئے نغمے جاگ اٹھے ہیں۔ وہ چاہتا تھا اٹھ کر الکا سے کہے —— بلا سوچے سمجھے اپنے جذبات مجھے سونپ دے، الکا! میری فنکارانہ رفاقت تیری روح کو بلوان بنائے گی۔ تیرا فن اور بھی چمکے گا۔

ہاں، پھر گگن منڈل پر پہاڑی سیج ہو گی۔ الکا ــــ الکارانی، تم نے اپنے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ تم تو یوں کنگھی چوٹی کرتی ہو۔ جیسے یہ بال تمہارے نہیں ہیں۔ تجھے کسی نے بتایا ہی نہیں کہ رقص کی طرح بالوں کا زیر و بم بھی ضروری ہے۔ جیسے ناچتے ہوئے پاؤں تھرکتے ہیں، ایسے ہی کنگھی گھومتی چلی جائے تاکہ بالوں کی انفرادیت نمایاں ہو سکے۔ بہت سی لٹیں تو تمہارے سر پر سوئی سی رہتی ہیں۔

کہو ــــ کہو، تو میں ان خوابیدہ ناگنوں کو جگا دوں۔ کہو تو.......

یکے والا گھوڑی کو گالی پہ گالی دئیے جا رہا تھا۔ رادھے شیام نے ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ گذشتہ شب کی محفلِ رقص و سرود میں وہ کچھ ایسا کھو گیا تھا کہ اُسے پتہ ہی نہ چلا کتنا راستہ کٹ گیا اور کتنا باقی ہے۔ یکے والے نے یہ سمجھ کر کہ مسافر کو جھپکی آ رہی ہے، اُس کا رباب اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

بنّو ــــ میری بانکی بنّو" یکے والا اپنی گھوڑی کو پچکار رہا تھا۔

رادھے شیام نے سوچا کہ چند لمحے پیشتر یکے والا گھوڑی کو گالیاں دے رہا تھا اب پچکار رہا ہے۔ زندگی میں قدم قدم پر اس قدر تضاد ملتا ہے کہ جواز نہیں۔

بجلی کے کوندے کی طرح گذشتہ شب کی کہانی پھر اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ جب الکا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ ماسٹر جی، ہارمونیم بھی ساز ہے لیکن رباب کا مقابلہ نہیں۔ تو اُس کے لب و لہجہ میں تکلف کا رتی بھر شائبہ نہیں تھا

اور پھر اس نے لچک کر کہا تھا کہ اگر اُسے پہلے خبر ہوتی تو وہ کب کی ہارمونیم پہ ناچنا بند کر چکی ہوتی۔

اُس کا خیال تھا کہ وہ لوگ ایک آدھ روز اور ٹھہریں گے۔ لیکن شاید نندن مہاراج کو یہ منظور نہ تھا۔ صبح پتہ چلا کہ وہ رات ہی کو وہاں سے چل دیئے تھے۔

اُس کا تن بدن سلگنے لگا۔ جیسے اُس نے ان مٹے طریقہ پہ دیپک گا دیا ہو۔ اور اب میگھ کے سُروں کے لیئے اُس کی رُوح بری طرح تڑپ رہی ہو۔ شوخ و تُنک آفتاب آگ برسا رہا تھا۔ ایسے میں بھلا کہاں سے میگھ اُمڈ آتے۔

یکّے کے ہچکولوں سے اُس پہ نیم خوابی کیفیت طاری ہونے لگی۔ پسینے کی کسیلی بُو پہ وہ بری طرح جھنجھلا اٹھا۔ وہ تو کسی مہکتے ہوئے نغمے کے لیئے تڑپ رہا تھا۔

اُس نے یکّے والے کا بازو کھینچ کر کہا: "کیوں میاں! بھلا بتاؤ تو سہی کہ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی چکّر میں گھومتے رہنا بہتر ہے یا آدمی آگے کو قدم اُٹھائے، چاہے اس کی رفتار سست ہی کیوں نہ ہو؟"

لیکن یکّے والے کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آئی اور اُس نے بغیر جواب دیئے گھوڑی کو پچکارنا شروع کر دیا: "میری بنّو، بس یہی چال چلتی چل!"

رادھے شیام نے پھر کہا: "یہ سنگیت اور برنت سے تو بڑی بڑی بیماریاں دُور ہو جاتی ہیں، میاں یکّے والے! آج محفل جمے گی۔ تم بھی وہیں ٹھہر جانا!"

یکّے والے نے ایک عجیب انداز سے مسکراتے ہوئے کہا: "یہ بھی بھلا کچھ

کہنے کی بات ہے؟

رادھے شیام سوچنے لگا الکا سے کہوں گا ـــــ الکا! تم تو باگیشوری ہو اور شاید وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے گی اور کہے گی۔ واہ ماسٹر جی! میں تو ابھی باگیشوری گا بھی نہیں سکتی۔ پھر میں اُسے کہوں گا ـــــ الکا، اگر تم باگیشوری نہیں تو اُس کی بہن راگیشوری ضرور ہو۔

اگر یکّے والا گویّا ہوتا تو وہ وقت کاٹنے اور اُس پر اپنا رعب جمانے کے لئے اُس سے بحث چھیڑ دیتا کہ بڑے میاں! بتاؤ تو بھلا، مہاراشٹر کے گویّے ہنڈول کو صبح کے وقت کیوں گاتے ہیں جبکہ ہم اِسے رات کو گاتے ہیں۔ ہر راگ کا وقت مقرر ہے نا اور یہ ہنڈول . . . اور اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ ایسے ہی اُسے محسوس ہونے لگا۔ جیسے دور الکا ہنڈولے پر جھولتی ہوئی ہنڈول گا رہی ہو۔ پھر ایک دھچکے نے اُسے تخیل کی دُنیا سے حقیقی دنیا میں لا پھینکا۔ یکّے کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی اور اس نے دیکھا کہ گھوڑی پسینہ پسینہ ہو رہی ہے۔

یکّے والے کی نگاہ سامنے سڑک پر تھی کبھی نہ ختم ہونے والی سڑک پر ـــــ وہ گھوڑی کو گالیاں دیتے اور پچکارتے تنگ آچکا تھا۔ اور اب اس نے اس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں۔

رادھے شیام سوچنے لگا کیا دو راگ بیک وقت ایک راگ نہیں الاپ سکتے؟ اور کیا دہ انسان بیک وقت ایک عورت سے محبت نہیں کر سکتے؟

لیکن نندن کہاں کا گائک ہے؟ وہ تو راگ کی ابجد بھی نہیں جانتا۔ نرا جاہل ہی تو ہے

یکے والا بولا "میرا چھوٹا بھائی پہاڑی خوب گاتا ہے۔"

رادھے شیام نے اپنی ساری مسکراہٹ آنکھوں کے ایک گوشے میں جمع کرتے ہوئے کہا "اس کے پھیپھڑے مضبوط ہوں گے۔ پہاڑی ہر کسی کے بس کا روگ نہیں میاں جی، اس میں گہرا سانس لینا پڑتا ہے۔ پہاڑی راگ بھی ہے اور رنگ بھی۔"

پھر وہ سوچنے لگا کہ میری الکا جب گاتی ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ زندگی کو قوسِ قزح کا لباس پہنا رہی ہو۔ اپنے ناچ میں وہ ہمیشہ حُسن کی تخلیق کرتی ہے ــــ حُسن، جس میں پرانی مسکراہٹیں نئی مسکراہٹوں میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ اس کی گھنی پلکیں گُن کلی کی طرح کانپنے لگتی ہیں۔ الکا الکا ــــ وہ خاموشی سے دہرانے لگا۔ تیری آواز تو بھینے بھینے خیال پور یا دھنا سری کی طرح پرواز کرتی ہے ــــ اور تیری مسکراہٹ ــــ الھڑ کنواری کھمباوتی کی طرح نشیلی معلوم ہوتی ہے۔

اُس کے ذہن میں اُس وقت مینا چہک اٹھی ــــ ماسٹر جی!

اور جیسے بلّی چلائی ــــ ماسٹر جی:

لیکن اُسے اُس دیپک گانے والے گوئیے کا دھیان آیا۔ جو اپنے راگ میں کچھ اس قدر کھویا ہوا تھا کہ گاتے گاتے آگ کی نذر ہو گیا تھا......

پھر جیسے الکا اُسے پکارنے لگی ــــ "ماسٹر جی، ماسٹر جی!" لیکن وہ اپنا پاپ

بجائے گیا۔ جیسے رباب کا نغمہ موت سے ٹکرا سکتا ہو۔ لیکن الکا چلّائے جا رہی ہے — ماسٹر جی — آگ کے شعلے — دوڑو — بھاگو — لیکن وہ تو اپنے رباب میں مست ہے۔ بےشک الکا کی پکار بے حد وزنی ہے۔ لیکن وہ تو یہ سمجھ رہا ہے جیسے وہ میگھ گا رہا ہو۔ یہ نغمہ تو کیسے مرے گا؟ میں تو کیا جلوں گا۔ میرے میگھ کے آگے دیپک کی لگائی ہوئی آگ کیسے ٹھہر سکے گی؟ الکا، تم تو نادان ہو، بھولی، ناسمجھ۔

یکّے والے نے اُس کے بازو کو جھنجوڑ کر کہا: "دیکھو جی گھوڑی کیا چال چل رہی ہے!"

رادھے شیام نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا: "میاں، تم بھی کبھی کسی کے پیچھے بھٹکتے پھرے ہو؟ یقیناً نہیں۔ بڈھے! تم جوان ہو سکتے ہو!"

یکّے والا کھُلی ہنسی ہنس کر بولا: "جی اب تو میں قبر میں پہنچ کر ہی جوان ہوں گا!"

رادھے شیام کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی مجاہد کی طرح قلعہ فتح کرنے جا رہا ہو . . . . پھر یک لخت اُسے محفلِ رقص و سرود کے خیال نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ رباب بجا رہا ہے۔ الکا اُس کے رباب پر تھرک رہی ہے۔ اُس کے ہونٹوں سے ایک نغمئی شراب رِستی ہوئی اُس کی روح میں تحلیل ہو رہی ہے اور پھر جیسے اس نغمے کی بھینی بھینی عطر بیز خوشبو فضا میں بکھر گئی، اِس کا نرم و نازک رنگ قوسِ قزح کی طرح چھا گیا۔ اس کا رسیلا ذائقہ اُس پر جادو سا کرنے لگا۔ اور وہ الکا کو اپنے بازوؤں میں تھامے، رقص کرتا ہوا، گاتا ہوا، اوپر

ہی اوپر اُڑتا چلا جارہا ہے —— دور بلندیوں پہ —— ایک جانی پہچانی منزل کی جانب —— جو ایک مدت سے اُسے پکار رہی تھی ......

اب سرائے نظر آنے لگی تھی۔ گھوڑی زور سے ہنہنائی اور یکے والا خوشی سے بولا: "بس دو قدم اور میری بنو —— دو قدم اور۔"

جیسے ہی یکہ رکا۔ رادھے شیام رباب اٹھائے لپک کر نیچے اترا۔ اور سرائے میں گھس گیا۔ اُس وقت اس کا سر اُونچا ہو گیا تھا۔ اُس کے قدم سبک خرامی دکھا رہے تھے۔

لیکن جب دوسرے ہی لمحے وہ، سرائے سے باہر نکلا۔ تو یکے والے نے دیکھا کہ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے اور وہ یکے پہ آکر گم سُم بیٹھ گیا۔ یک لخت اُس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اُلٹا کانہیں زندگی کا تعاقب کر رہا ہے —— زندگی جو ایک ترنکی کی طرح مسکراہٹیں بکھیرتی ہے اور ایک ساحرہ کی طرح نین مٹکا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اُس نے یکے والے کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور آہستہ سے کہا: "اگلے پڑاؤ کی طرف ......"

تلافی

وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور ایک مٹھی چاول ہوا میں اچھالتے ہوئے لاپرواہی سے آگے بڑھ گیا۔ غار سے چلتے وقت اس نے اکیس مٹھی چاول ہوا میں اچھالنے کی رسم پوری کر دی تھی۔ اور اکیس بار چاول کی شراب کی بوندیں دھرتی پر گرا دی تھیں۔ اب ان مردود سپاہیوں کی روحیں اس کا پیچھا نہ کر سکتی تھیں۔

چاندنی رات کے رینگتے پھیلتے سایوں میں ناگا پہاڑیاں دشمن کی گھات میں کھڑے ہوئے جوانمردوں کی طرح اونچی نیچی ہوتی گئی تھیں۔ چاند بھی کوئی خونی معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ خون سے رنگے ہوئے چہرے پر اتر رہا ہو۔ ستارے بھی خونی تھے۔ انہوں نے بھی دشمنوں کے سر کاٹ لئے تھے۔ اس نے حقارت سے ان کی طرف دیکھا جیسے وہ

انہیں بتا دینا چاہتا تھا کہ اکیس سپاہیوں کو تنہا موت کے گھاٹ اتار کر اس نے نئی مثال قائم کر دی ہے۔

رات بھر وہ اس دور رہنے والی غار میں گھات لگائے بیٹھا رہا تھا۔ اکیس کی اکیس لاشوں کو غار میں لے جا کر اس نے سب کے سر کاٹ ڈالے تھے، اور دن بھر وہ وہیں دبک کر بیٹھا رہا تھا۔

یہ پگ ڈنڈی اس کی جانی پہچانی تھی۔ رات بھر کے سفر کے بعد وہ صبح صبح اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ایک بار پھر اسے خدشہ سا محسوس ہوا، جیسے سپاہیوں کی روحیں چیختی ہوئی اس کا پیچھا کر رہی ہوں۔ مردود روحیں۔ یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور چور نگاہوں سے پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے پہاڑ پر چڑھتا چلا گیا۔

اس کے کندھے پر نئے بانس کی نئی کانور تھی۔ جس کے دونوں پلڑوں میں خون آلودہ سر لٹکائے ہوئے تھے۔ اگلے پلڑے میں چاول کی ڈلیا رکھی ہوئی تھی جو نصف سے زیادہ خالی ہو چکی تھی۔ اس کے قریب چاول کی شراب کی مٹکی تھی جس میں مشکل سے ایک چوتھائی شراب باقی ہو گی۔ پچھلے پلڑے میں اکیس کی اکیس لاشوں سے کاٹی ہوئی ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں تھیں اور ساتھ ہی وہ کٹار بھی جس سے اس نے دشمنوں کو مار گرایا تھا اور ان کے سر کاٹ ڈالے تھے۔ دونوں پلڑوں میں ان سروں کو بہت قرینے سے ٹکایا گیا تھا۔ دونوں پلڑوں پر موٹی رسیوں کا جال تنا ہوا تھا۔

اور کسی چیز کے گرنے کا اندیشہ نہ ہو سکتا تھا۔

اسے یقین تھا کہ اسے اس بزدل، کمینے سپاہی کا سر بھی مل گیا ہے جو روہی کی بڑی بہن رین سالی کو زبردستی اٹھا لے گیا تھا۔ روہی اسے دیکھ کر میری بہادری کا ترانہ چھیڑ دے گی۔ رین سالی بھی خوش ہو جائے گی۔ رین سالی خود روہی سے کہے گی۔ رشمو تو بہت بہادر نکلا روہی! اب تم اس کی دلہن بن جاؤ ——— آخر اتنا بڑا بہادر روز روز تو پیدا نہیں ہوتا۔ اتنا بڑا بہادر جس نے ماں کے دودھ کی لاج رکھ لی ——— یہ سوچتے ہوئے وہ پگڈنڈی کی ناہموار سطح پر تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔

غار سے چلتے وقت اس نے چاول کی شراب کے کچھ گھونٹ حلق میں اتار لئے تھے۔ ارے یہ تو مدھو ہے مدھو۔ آسامیوں کی طرح ایک ناگا بھی تو اسے "مدھو" کے نام سے پکار سکتا ہے۔ مٹکی میں مدھو چھلک رہا ہے جانے مدھو کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب راستے میں مدھو بالکل نہ پئے، گھر پہنچ کر پتوں کے ڈونے بھر بھر کر روہی اور رین سالی کو پلائے ——— روہی کی آنکھوں میں نئی چمک آ جائے گی رین سالی مست ہو جائے گی دونوں بہنیں خوش ہو کر میری طرف دیکھیں گی۔ ایک اور بیس اکیس ——— پورے اکیس سر۔ روہی کہے گی، اب تو میں ضرور اپنے رشمو سے بیاہ کروں گی ——— مدھو روہی کو ایک نئی زبان دے گا! اور وہ کہے گی، رشمو میں ہمیشہ تمہاری تھی۔ اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔

اسے اپنے بزرگوں کے اس عقیدے پر فخر تھا کہ جب تک ایک نوجوان کسی دشمن کا سر نہ کاٹ لائے اسے بہادر کا خطاب نہیں مل سکتا اور جب تک وہ کسی لڑکی کو یادگار فتح کے طور پر اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارے ہوئے دشمن کا سر نہ دکھا دے وہ اسے اپنا دولہا بنانے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔

ادھر بہت برسوں سے یہ روایت نابود ہوتی جا رہی تھی۔ کسی کا سر کاٹنے کا مطلب تھا پھانسی کی سزا لڑکیاں بھی سمجھ گئی تھیں۔ انسانی سر کی پیش کش کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ ناگا کسان پرانے جمع شدہ سروں کی قبائلی ناچ کے موقع پر نمائش کو چھوڑتے تھے۔ لیکن جب سے برما کی سرحد پار کرتے ہوئے جاپانیوں نے ناگا پہاڑیوں کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا، ناگا دوشیزاؤں نے پھر سے انسانی سر کی پیش کش کو بیاہ کے لئے لازمی شرط قرار دے دیا تھا۔

اس کے کان میں روہی کی آواز گونج اٹھی — رشمو، او رشمو! دھنکار ہے تمہاری بہادری پر اگر تم اس پاپی کا سر کاٹ کر نہ لا سکو جو اس دن ریبن سالی کو زبردستی اٹھا لے گیا تھا۔۔۔۔ اسے یاد تھا کہ کس طرح اس نے روہی کو ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ ارے یہ تو بہت کٹھن شرط ہے، روہی۔ اب خاص طور پر اسی پاپی کا سر میں کہاں سے لا سکتا ہوں؟ ان سب کے دانت اونچے اونچے ہیں، ناک چپٹی، قد چھوٹا، کوئی لاکھ جتن کرے، روہی، ایک جیسے ہی تو معلوم ہوتے ہیں یہ سب لوگ۔ اب خاص اس پاپی کا سر مجھے کہاں ملے گا؟۔۔۔۔۔۔ روہی کی آواز برابر گونجتی رہی

رشمو میں کہے دیتی ہوں کہ میرا دولہا وہی بنے گا جو رین سالی کا بدلہ لے گا۔ تم تو دیکھ ہی رہے ہو، رشمو، کہ جب سے رین سالی اس پاپی سے اپنا "ست" لٹوا کر آئی ہے، وہ بالکل چپ چاپ رہتی ہے ...... رین سالی کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ ایک حواس باختہ لڑکی۔ شاید وہ دشمن کی چھاؤنی سے بھاگ کر آئی تھی۔

اب تو میں یقیناً کامیاب ہو چکا ہوں، اس نے سوچا، اکیس کے اکیس سپاہیوں کو مار گرانا ہر کسی کے بس کا روگ تو نہیں ہو سکتا۔ چلتے چلتے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھ مکمل خاموشی تھی۔

ہر ناگا یہی سوچتا تھا کہ جب سے سر کاٹنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ زمین کی گرمی کم ہو گئی ہے اور اسی لئے زمین کی پیداوار بھی گھٹ گئی ہے۔ لیکن جنگ چھڑتے ہی زمین کی گرمی پھر سے بڑھنے لگ گئی تھی۔ اب تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ گرمی صدیوں تک قائم رہے گی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اچانک اس کے کندھے سے کسی نے کانور کا بوجھ اٹھا لیا ہے ...... روہی کی آواز اس کے ذہن میں پھر سے گونج اٹھی۔ اس پاپی کی روح تیری غلام ہو گئی ہے، رشمو! اب وہ خود تیری کانور اٹھا کر چلے گی۔ تیرے ساتھ ساتھ ....

ایک نہ دو نہ تین، پورے اکیس سر یعنی تو کم تیس۔ ارے میں نے تو کم تیس سر کاٹ ڈالے۔ ارے یہ بچوں کا کھیل تھوڑا ہے، روہی — اپنے ذہن میں وہ ناگا دوشیزہ سے کہہ رہا تھا۔ ارے روہی، جس نے شیر کے بچے کی طرح شیرنی کا دودھ

پیا ہو، وہی تو ایک سروں کا نور کے دونوں پلڑوں میں لٹکا کر تیز قدموں سے چل سکتا ہے۔

پہلے تو چاندنی رات کبھی اتنی خاموش نظر نہ آتی تھی۔ سائے پگھلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑیاں ستاروں سے بھرے ہوئے آسمان میں دھنسی جاتی تھیں۔ یہ پہاڑیاں پہلے تو کبھی اتنی پُر اسرار نظر نہ آئی تھیں۔

اسے خون کی بُو آ رہی تھی۔ یہ بُو تو آئے گی ہی، اس نے دل و دماغ کو سمجھایا، اسے کون ہٹائے۔ اُس نے اپنے خون آلودہ ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا میں رٹمو ہوں رٹمو، سر کاٹنے والے بزرگوں کا بیٹا۔

اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس کا پاؤں ایک جگہ لانبی لانبی گھاس میں دھنس گیا۔ اُسے خیال آیا کہ کس طرح وہ گاؤں چھوڑتے ہوئے روہی سے کہہ کر آیا تھا ارے دیکھنا، روہی، اب کپڑا بُننے کی غلطی نہ کر بیٹھنا ورنہ تیرا رٹمو جنگل میں چلتے چلتے کسی بیل میں پیر الجھ کر گرنے سے مرجائے گا۔ جب میں لوٹ آؤں تو خوشی سے کپڑا بُننا ...... اس نے اپنے پاؤں کو آگے اٹھاتے ہوئے سوچا۔ ارے یہ تو گھاس ہے بیل تو نہیں۔ میرا پاؤں کیسے الجھ سکتا ہے؟ .... اور پھر اس کے ذہن میں روہی کا بول گونج اٹھا — میں کیوں کپڑا بُنوں گی۔ رٹمو، میں اتنی پاگل تھوڑی ہوں؟

گھر سے چلتے وقت اسے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ اتنی جلد کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہو جائے گا۔ کندھے پر کا نور کا بوجھ اسے پھر سے محسوس ہونے لگا۔ اسے خیال آیا چلو اچھا

ہی ہوا کہ باقی بدکرداروں کی طرح اس پاپی مردود کی روح بھی پیچھے رہ گئی۔ اور تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

اوپر ستاروں میں اسے روہی مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ چاند اب پھیکا معلوم ہو رہا تھا۔ پھیکے چاند پر روہی کا چہرہ ابھر آیا۔ جیسے وہ اسے پکار کر کہہ رہی ہو، حسن رین سالی کا دماغ روہی کا۔ رشمو، حسن کے تو سو بیری ہیں، دیکھو رین سالی کا کیا حال ہوا۔ وہ لشکری پاپی اسے پکڑ کر لے گیا تھا، رشمو۔ جانے کس طرح پاپی نے رین سالی کا "ست" ناش کیا ہوگا میں تو کانپ اٹھتی ہوں۔ رین سالی تو پھر بھی بچ کر نکل آئی۔ ورنہ ان کے نیچے سے کب کوئی ناگا لڑکی کان یا ناک کٹوائے بغیر واپس آئی ہے؟

اس نے کانذر میں لٹکائے ہوئے سروں کی طرف دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ ان میں اس پاپی کا سر بھی ضرور موجود ہوگا۔ دوبارہ چاند کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن روہی کا چہرہ چاند کے داغوں میں تحلیل ہو چکا تھا۔ بڑی نفرت سے اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور مستقل مزاجی سے پاؤں بڑھاتے وہ روہی سے ملنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔

روہی کا خیال آتے ہی اسے فوراً اپنے بزرگوں کا خیال آ گیا۔ اس کا باپ جیسے آیا تھا ویسے ہی چلتا بنا۔ اس کا دادا البتہ بہادر نکلا تھا۔ اس نے سات سر کاٹنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ساتوں کے ساتوں سر ابھی تک ان کے گھر میں موجود تھے۔ تین سر ایک طرف، تین سر ایک طرف۔ بیچ میں وہ سر جو اس نے اپنی دلہن کو پیش کیا تھا۔

یہ سات سر اس کے دادا نے پچاس برس کے عرصے میں حاصل کئے تھے۔ اور یہاں یک بارگی اکیس سر کاٹ لئے گئے تھے۔

ابھی کوئی دس گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ سائے اور بھی گہرے ہو گئے تھے۔ ان سایوں میں ہمیشہ مرے ہوؤں کی روحیں بھٹکتی ہیں۔ وہ جن کے سر کاٹ لئے گئے۔ وہ ڈر گیا۔ جیسے اکیس کی اکیس روحیں چیخیں مار رہی ہوں۔ اسے خیال آیا کہ ہو نہ ہو اس پاپی مردود کی روح باقی روحوں کو اس کے خلاف بھڑکا رہی ہے۔ جیسے اب سب روحیں اس کے خلاف سازش کر رہی ہوں۔ اس نے کانور زمین پر رکھ دی۔ ڈلیا سے ایک مٹھی چاول ہوا میں اچھال دیا۔ مٹکی سے تھوڑا مدھو زمین پہ گرایا۔ اسے اب روحوں کا شور کم ہوتا سنائی دیا۔ جیسے ہوا میں ایک خاموش نغمہ تھرک رہا ہو۔

کانور اٹھا کر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ اب وہ ایک ایسی جگہ گزر رہا تھا، جہاں ہوا پھولوں کی خوشبو سے سست رفتار ہو گئی تھی۔ یہاں کیسے کیسے پھول کھلے ہیں؟ اس نے سوچا، دن کا وقت ہوتا اور روہی بھی ساتھ ہوتی تو وہ مل کر پھول چنتے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ہار پروتا اور روہی کے جسم پہ ان کا ایک جال سا بُن دیتا۔

مٹکی میں مدھو چھلک رہا تھا۔ زمین پہ مدھو کی بوندیں بہت ٹپکائی جا چکیں۔ روحوں کو بھی مدھو پیارا ہے۔ اس نے ذرا رک کر مدھو کے کچھ گھونٹ حلق میں اتار لئے۔

ستارے اسے گھور رہے تھے۔ لیکن اس نے ان پر ایک باغیانہ نگاہ دوڑائی جیسے وہ انہیں خاطر میں نہ لاتا ہو۔

معاً اسے اس کہانی کا دھیان آیا جو پہلے پہل اسے روہی نے سنائی تھی۔ یہ اس وقت کی کہانی تھی جب سورج چاند تھا۔ اور چاند سورج۔ دنیا ابھی شروع ہی ہوئی تھی۔ اس وقت چاند سورج سے زیادہ گرم تھا۔ رات کو بھی اتنی گرمی پڑتی کہ جنگل جھلس جاتا اور انسان بھی پناہ مانگتے نظر آتے۔ پھر ایک دن چاند نے جو اب سورج ہے، سورج سے جو اب چاند ہے۔ کہا کہ بھائی تم تو بہت ظالم ہو۔ اس طرح دنیا کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ اب میں تمہیں سورج نہ رہنے دونگا۔ وہ جھٹ سورج بن گیا۔ اور سورج کو چاند بنانے کی غرض سے اس کے چہرے پر گوبر مل دیا۔ اس نے روہی سے سنا تھا کہ چاند پر جو داغ نظر آتے ہیں۔ اسی گوبر کے داغ ہیں۔ لیکن وہ خود بھی تو روہی کا منہ چڑایا کرتا تھا۔ اور ہمیشہ کہا کرتا تھا۔ کہ یہ کہانی تو بہت بڑی گپ ہے۔ کبھی وہ اسے چھیڑنے کے لئے یہ بھی کہہ دیتا۔ کہ لاؤ میں بھی تمہارے چہرے پر گوبر مل دوں۔ اور روہی جھٹ بول اٹھتی ——— رہنے بھی دو، پہلے ہی میں کونسی خوبصورت ہوں؟

اسے یاد آیا کہ کس طرح ایک روز اس نے روہی سے کہا تھا کہ شروع دنیا میں چاند اور سورج دونوں دن کے وقت نکلا کرتے تھے۔ سورج کو ایک لڑکی سے محبت تھی۔ وہ بولی، پہلے کسی کا سر کاٹ کر لاؤ۔ پھر میں تمہارے ساتھ بیاہ کروں گی۔ چاند کو کسی طرح پتہ چل گیا۔ کہ سورج اسی کا سر کاٹ ڈالنے پر آمادہ ہو رہا ہے۔ چاند بھاگ گیا اور دن کی بجائے رات کو چڑھنے لگا۔

اس نے چاند کی طرف محبت سے دیکھا۔ اور چاند پر روہی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش

کرتا رہا۔ لیکن اسے ذرا کامیابی نہ ہوئی۔

پگ ڈنڈی اب پہاڑ کے اوپر اوپر جا رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ مدھو کا نغمہ الاپنے لگا۔ مدھو کا ازلی و ابدی نغمہ:

لال لال خون بہتا ہے تو بہنے دو۔
ہڈیاں بھی ٹوٹنے ہی کے لئے بنائی گئی ہیں۔
خون بہنے ہی کے لئے پیدا ہوتا ہے۔
مدھو پی کر سر کاٹنے کا مزہ ہے۔
گاؤ گانے والو، مل کر گاؤ۔
ناچو ناچنے والو، مل کر ناچو۔
مل کر ہی گانے، ناچنے کا مزہ ہے۔
مدھو پی کر سر کاٹنے کا مزہ ہے۔
کوکھ جلی کیا لوری دے گی؟
بزدل کیا کھا کر لڑے گا؟
بزدل کو کون دلہن پسند کرے گی؟
مدھو پی کر سر کاٹنے کا مزہ ہے۔
بھیڑوں اور بھیڑیوں کی کیسی دوستی؟
پڑے پڑے تو لوہے کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔

موت سے پہلے مرنے سے کیا فائدہ؟

مدھوپی کر سر کاٹنے کا مزہ ہے۔

اسے بڑی شدت سے مدھو پینے کا خیال آیا۔ ٹکی میں مدھو چھپک رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ اب یہ مدھو گھر پہنچ کر ہی پیا جائے —— روہی اور رین سالی کے ساتھ!

آخر کب تک ایک نوجوان مورنگ میں سوتا رہے ہے؟ اس نے سوچا، آخر کبتک۔ بیس اور ایک اکیس۔ اکیس سر۔ اب روہی کیسے انکار کر سکتی ہے؟ اب بس اس کی ہاں چاہیئے۔ پھر اس کے دام اس کے ماں باپ کو چکا دینا کچھ کٹھن نہیں۔

نہیں؛ اب میں مورنگ میں سو کر راتیں نہیں گزار سکتا۔ اس نے سوچا، مورنگ! مجھے مورنگ سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ رات کو گاؤں بھر کے بن بیاہے لڑکے مورنگ میں سوتے ہیں۔ ایک ہی جھونپڑے میں مل کر سونے کی رسم نہ جانے کتنی پرانی ہوگی۔ اس جھونپڑے کو مورنگ کا پیارا نام دیکر ہمیں خوش کرنے کا جتن کیا گیا ہے۔ اس کے ذہن کے کسی کونے سے روہی کی آواز آرہی تھی —— رشمو، اور رشمو۔ ہم نیا گھر بنائیں گے، ہم اچھا دھان اگانے والے دانگسی دیوتا کی جے منائیں گے!

ایک بار پھر خون کی بو اسے شدّت سے محسوس ہونے لگی۔ ارے ارے یہ بدمعاش روحیں تو مجھے کسی کھڈ میں گرا کر دم لیں گی —— یہ کمینی، بدکار روحیں! وہ کانور چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ کانور رکھ کر بیٹھ گیا۔

اپنی کلائی پر بندھی ہوئی کوڑی کو چھوتے ہوئے اس نے سوچا، کوئی ڈر نہیں
ان روحوں سے بچانے کے لئے تو یہ ایک کوڑی ہی کافی ہے۔ گانٹھ سے کھول کر
اس نے پیازہ کو چھوا اور اپنے دل کو مضبوط کر لیا۔ پیازہ کے جادو پر اسے یقین تھا۔
جاؤ جاؤ، او بدکردار روحو، اس نے چلا کر کہا، اسی غار میں جاؤ جہاں تمہارے
جسم پڑے ہیں۔ ایک رین سالی کا کیوں، میں نے تو سینکڑوں لڑکیوں کا بدلہ لیا ہے۔
تمہارے کالے پاپوں کا بدلہ۔ جاؤ جاؤ تمہارے سراب تمہیں نہیں مل سکتے..... اسے
یقین تھا کہ آخر خون نے اپنا اثر دکھایا۔ وہ انتقامی خون جو اسے ورثہ میں ملا تھا.....
کانور اٹھا کر وہ پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ روحیں پیچھے ہٹ گئیں تھیں۔
ناپاک روحیں۔ اس نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے زور کا قہقہہ لگایا۔ قہقہہ، جو
ہتھوڑے کی چوٹ کا حکم رکھتا تھا۔ بدکردار روحیں! اب وہ میرا پیچھا نہیں کر سکتیں
اس نے کانور کے پلڑوں میں پڑے ہوئے سروں کی طرف دیکھا اور روہی کے
خیال میں کھو گیا۔ اس نے بدلہ لے لیا۔ رین سالی کا بدلہ اور پھر وہ اور سوچنے لگا کہ روہی کیسے گی۔ اور شمو میری
آواز میں تو سو سو گیت گھلے ہوئے ہیں۔ گویا اسے روہی کی آواز سنائی دے رہی تھی
..... سو سو گیت کیوں نہ گھلے ہوئے ہوں تمہاری آواز میں روہی —— وہ بولا اری
جب تو بچی تھی تو پہلے پہل ماں نے تجھے بلبل کا گوشت کھلایا ہوگا..... تو کیا میں
سچ مچ بلبل کی طرح چہکتی ہوں، رشمو؟ —— اور پھر یکبارگی جیسے بہت سی چیخیں
فضا میں گونج اٹھی ہوں جیسے روہی کی جادو بھری آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس

شور میں گھل مل گئی ہو۔

تاروں کی بھیگی بھیگی چھاؤں ختم ہو تی گئی۔ وہ پگڈنڈی پر چڑھتا چلا گیا۔ ابھی سورج نکلنے میں دیر تھی۔ اس نے سوچا رین سالی اسی طرح اپنی جھونپڑی کے قریب چٹان پر بیٹھی ہو گی۔ ابھی تک اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا نہ ہوئی ہو گی۔ جب سے جان چھڑا کر واپس آئی ہے، وہ کسی سے بات بھی نہیں کرتی۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہو جائے گی۔ میں اس کے دشمن کا سر اسکے قدموں میں رکھ دونگا۔

اسے پگڈنڈی پر غصہ آنے لگا۔ ابھی اور کتنے موڑ آئیں گے۔ اسے خیال آیا کہ شاید ان سروں میں اس مردود کا سر نہ نکلے۔ یک بیک کا نور بوجھل ہو گئی۔ وہ تھک چکا تھا۔

اُوپر کو اٹھتی ہوئی پگ ڈنڈی پھر نیچے اُترنے لگی۔ وہ رُکا نہیں۔ اگلے موڑ سے پگ ڈنڈی پھر اُوپر کو چڑھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں رین سالی کی ساکت و جامد نگاہیں پھر گئیں۔ کیا اب اس کی نگاہیں ہمیشہ ساکت و جامد نظر آئیں گی؟

اب وہ اس اونچی چٹان کے قریب پہنچ چکا تھا جس کے اس پار روہی اور رین سالی کی جھونپڑی تھی۔ اسے یقین تھا کہ روہی اسے دیکھ کر بھاگی چلی آئے گی اور کہے گی —— رشمو، میرا رشمو، سروں کا شکاری رشمو! تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا۔ پورب میں سورج نکل آیا تھا۔ وہ چٹان بہت پیچھے رہ گئی

تھی۔ اور اب روہی اور رین سالی کی جھونپڑی نظر آرہی تھی۔

رین سالی سورج کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی، جیسے وہ اس ٹھگنی سی چٹان کی شہزادی ہو۔ سورج کی پہلی کرنیں اس کے غمزدہ چہرے پر سونے کا پانی پھیر رہی تھیں۔ روہی اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے یوں کھڑی تھی، جیسے وہ اس کی کالی کالی آنکھوں میں حسن کی نئی کروٹوں کا منظر دیکھنا چاہتی ہو،

یونہی رشمو نزدیک پہنچا روہی نے دوڑ کر اس کا استقبال کیا۔ سورج کی پہلی کرنوں میں کافور کے پلڑے چمک اٹھے تھے۔

"اتنے سر" وہ بولی، "رشمو، میرا بہادر رشمو!"

رین سالی اسی طرح اس ٹھگنی چٹان پہ بیٹھی رہی جیسے اسے رشمو سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ رشمو نے کافور اتار کر چٹان کے قریب روہی کے قدموں میں رکھ دی۔

سورج کی کرنیں رین سالی کے جسم پر پھیل رہی تھیں۔ جنگلی کیلے کے بیجوں کی مالا اس نے نہ جانے کہاں اتار پھینکی تھی۔ اب تو اس کے بازوؤں میں کہنیوں سے اوپر جست کے بازوبند بھی نظر نہ آتے تھے۔ دونوں بہنوں کے جسم پر صرف وہی ایک کپڑا تھا جو کمر سے گھٹنوں تک لٹک رہا تھا۔ ادھر جب سے رین سالی کا "دوست" لٹ چکا تھا اس نے اپنے جسم کی طرف کچھ توجہ ہی نہ دی تھی۔ روہی نے بھی مناسب نہ سمجھا تھا کہ اپنے جسم کو تیل سے چمکائے۔ اب اسے اپنے بازوبند دیکھ کر شرم محسوس ہوتی۔ جنگلی کیلے کے بیجوں کی مالا بھی اسے بدصورت معلوم ہونے لگی۔

روہی جلدی جلدی کا نور کے دونوں پلڑوں سے رسیوں کا جال کھول رہی تھی۔ خوشی خوشی ایک سر نکال کر اس نے رین سالی سے پوچھا "کہیں یہی تو اس پاپی کا سر نہیں، رین سالی؟"

رین سالی کچھ نہ بولی۔ روہی نے خود کہا "یہ اس کا سر نہیں ہو سکتا..." ایک لمحہ کے لئے اس کی نگاہیں اس پر گڑ گئیں۔ پھر اس نے آہستہ سے اسے ایک طرف زمین پہ رکھ دیا۔

رشمو خاموش کھڑا روہی اور رین سالی کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا۔

دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، ان میں روہی کو وہ سر کہیں نظر نہ آیا۔ رین سالی کی ساکت و جامد نگاہوں میں زندگی کے آثار پیدا ہوتے نظر نہ آتے تھے۔

رشمو نے اکھڑی اکھڑی آواز میں کہا: "تو گھبرا ڈ مت، رین سالی، میں پھر جاؤنگا میں ہزار بار جاؤں گا۔ کوئی پروا نہیں، میں نے بھی ماں کا دودھ پیا ہے۔ میں اپنے خون کی پکار سن سکتا ہوں۔"

روہی کانور سے سر نکال نکال کر بڑے غور سے دیکھتی جاتی تھی۔ بولی۔ "کیا ان میں وہ سر نہیں ملے گا؟ رشمو، تجھے پھر جانا ہوگا۔ تجھے تو انکار نہ ہوگا لیکن کیا میں تیری جان پھر جوکھوں میں ڈالونگی؟"

پھر ایک سر نکال کر وہ دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ جیسے یہ اسی مردود کا سر ہو۔ اس نے کئی بار رین سالی سے پوچھا۔ وہ حیران تھی کہ اس مردود کی پہچان رین سالی

کو اتنی جلدی کیسے بھول گئی۔

رین سالی کے چہرے پر پیلاہٹ کی تہ موٹی ہوتی جاتی تھی۔ آنکھوں میں مردنی چھا رہی تھی۔ لب ساکت تھے، جیسے وہ پتھر سے تراشی گئی ہو۔

رشمو نے ایک بار پھر اسی اکھڑی اکھڑی آواز میں کہا — ”رین سالی، میں پھر جاؤنگا۔ میں ہزار بار جاؤنگا۔“

روہی نے نیا سر نکالتے ہوئے چمک کر کہا — ”یہ بھی نہیں تو اور نکالتی ہوں ابھی تو کئی سر باقی ہیں“۔

روہی نے ایک ایک کر کے کئی سر نکالے۔ لیکن وہ مایوس ہوتی گئی — فضا میں خون کی بو سما گئی۔ انسانی سروں کا ڈھیر بہت بھیانک معلوم ہوتا تھا۔ وہ سب جذبات جو عین مرتے وقت ان لوگوں کے دل و دماغ کو چھو گئے ہوں گے اب ان کے چہروں پر ساکت و جامد نظر آتے تھے۔

روہی مایوس ہو کر قریب ہی دوسری چٹان پر جا بیٹھی۔ رین سالی اپنی جگہ سے ذرا نہ ہلی۔

رشمو نے دیکھا کہ ابھی کانور میں تین چار سر اور پڑے ہیں۔ وہ کانور کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے ایک سر نکال کر رین سالی کو دکھایا اور پوچھا — ”یہ تو نہیں؟ ......“

ایک لمحہ کے لئے وہ اسے گھورتی رہی اور پھر ڈھیر اس نے اسے پر پھینک دیا

اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ پھر جانا ہوگا۔ ایک بار نہیں سو بار ہزار بار۔

ڈرتے ڈرتے اس نے آخری سر نکالا۔ اسے دیکھتے ہی رین سالی اٹھ کر کھڑی ہوگئی اس وقت اسکی آنکھوں میں چمک تھی۔ جیسے اس کے ذہن میں سب یاد تازہ ہو رہی ہو۔ رین سالی نے آگے بڑھ کر یہ سر رشمو کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ اسے غور سے دیکھتی رہی۔ معاً اس نے اس پر تھوک کر اسے زمین پر پھینک دیا۔

رشموؔ نے خوشی سے چلا کر کہا: "ارے یہی تھا وہ کمینہ؟ اسے تو میں نے سب سے پہلے مارا تھا۔ باقی بیس تو میں نے بعد میں دبوچے تھے۔ اس کے کوٹ پر ایک تمغہ بھی تھا۔"

گانٹھ کھول کر رشموؔ نے وہ تمغہ رین سالی کو دکھایا۔ یکلخت رین سالی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اس نے ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے غرور سے سر اٹھایا، ایک لمحہ کے لئے کٹے ہوئے سر کی طرف غور سے دیکھا اور وہ پوری طاقت سے چلّائی:
—— "بزدِل!"

وہ بُت کی طرح خاموش کھڑی تھی۔ دوسرے لمحے میں اس نے دیکھا کہ زمین پر پڑے ہوئے سر کو رین سالی نے زور سے ٹھوکر ماری اور وہ لڑھکتا ہوا پرے کھڈ میں جا رہا تھا۔ رین سالی کے زرد چہرے پر مسرّت ناچ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس کی کھوئی ہوئی دوشیزگی واپس مل گئی۔

جھمکے

اس پر مجرم کا گمان نہ ہو سکتا تھا۔ کانوں تک تراشے ہوئے پٹے، ململ کی پگڑی لٹھے کی قمیص، ہری ریشمی مرزئی، سپید بوسکی کا تہمد۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی نہ ہوتی تو اسے دیکھ کر یہی خیال آتا کہ وہ کوئی براتی ہے۔

دونوں سپاہیوں نے جھٹ اپنے لئے جگہ بنالی۔ یہ چھبیلا مجرم کھڑا رہا۔ ساتھ والے مسافر کو دھکیلتے دھکیلتے میں نے اس کے لئے جگہ بنادی۔ ساتھ والا مسافر غرایا۔ لیکن تب تک یہ مجرم بیٹھ چکا تھا۔

یہ تو ظاہر تھا کہ وہ جانگلی ہے۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ لیکن سامنے کی سیٹ والی لڑکی نے اپنی لال جلد والی کتاب سے نگاہ نہ اُٹھائی۔ یہ کتاب شاید اس چھبیلے مجرم

سے زیادہ دلچسپ تھی۔

کالی واڑھی والا سپاہی کہہ رہا تھا "جانگلی جیسا جھوٹ کوئی نہیں بول سکتا۔"

دوسرے سپاہی نے اپنی کھچڑی واڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا:

"جانگلی جیسی چوری بھی کوئی نہیں کر سکتا۔"

سپاہیوں میں بحث چھڑ گئی۔ کھچڑی واڑھی والا سپاہی کہہ رہا تھا: "جانگلی ماں اپنے بیٹے کو بھی لوری دیتی ہے کہ بیٹا کوئی اچھی سی چوری کر کے لانا۔"

اس لڑکی نے سپاہیوں کی طرف گھور کر دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو، جھوٹے اور چور تو تم خود ہو۔

کالی داڑھی والا سپاہی بولا "اسے دس سال کا حکم ہوا ہے۔"

"دس سال؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں دس سال" سپاہی نے جواب دیا "اور جانگلی کے لئے دس سال بھی دس دن کے برابر ہیں۔ آپ نہیں جانتے۔ جانگلی قید سے نہیں ڈرتا۔"

جانگلی نے قہقہہ لگایا۔ یقیناً اسے دس سال کی قید سے ذرا خوف نہ آتا تھا۔

کالی داڑھی والا سپاہی بولا "گری نکالنے کے لئے ضروری ہے کہ چھلکا توڑ ڈالا جائے۔"

کھچڑی داڑھی والے سپاہی نے کہا: "اور جب تک گری کو چکھا نہ جائے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ میٹھی ہے یا کڑوی۔"

جانگلی نے پھر قہقہہ لگایا، جیسے کہہ رہا ہو، پہلے میں نے چھلکا توڑ ڈالا، اب

میں گری کو چکھ رہا ہوں، کڑوی ہے چاہے میٹھی، تمہیں اس سے کیا واسطہ ؟"

دونوں سپاہیوں نے جانگلی کو ڈانٹ بتائی۔ جانگلی نے پھر قہقہہ لگایا۔ سپاہی بھی ہنسنے لگے۔ سامنے کی سیٹ سے اس لڑکی نے بھی دبی دبی مسکراہٹ جانگلی کی طرف پھینکی، جیسے کہہ رہی ہو، تم بہادر ہو، مجھے یقین ہو گیا۔

جانگلی نے پٹے جھٹکائے اور اس کے چہرے پر ایک آزاد، کھلنڈری مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

میں نے کہا۔ "تمہارا نام ؟"

"نابُو" اس نے اور بھی کھل کر کہا۔

"شادی ہو گئی ؟"

"ابھی تو دس سال دُور ہے۔"

"دس سال کی قید کس جرم میں ؟"

"چوری۔"

"ایسی کیا ضرورت تھی ؟"

"ستمی کی خاطر۔"

"ستمی کون ؟"

وہ جھینپ سا گیا۔ سامنے کی سیٹ والی لڑکی دھیان سے ہماری باتیں سُننے لگی تھی۔ اور اُس وقت اُس کی سونے کی بالیاں ڈگمگ ڈگمگ ڈول رہی تھیں۔

کالی داڑھی والا سپاہی بولا "جب تک جانگلی گبھرو چوری نہ کر لائے کوئی لڑکی اس کے ساتھ بیاہ کرنے کو راضی نہیں ہوتی"۔

اس لڑکی نے سپاہیوں کی طرف گھور کر دیکھا، جیسے وہ کہہ رہی ہو، یہ بالکل غلط ہے۔ کوئی اچھی لڑکی کسی چور کے ساتھ شادی نہ کرے گی"۔

نابو نے اپنے پٹے جھٹکائے اور اپنی پگڑی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

کالی داڑھی والا سپاہی بولا "جب تک جانگلی گبھرو چوری نہ کر لائے اس کے سر پر پگڑی نہیں بندھتی اس کا بیاہ نہیں ہو پاتا"۔

کھچڑی داڑھی والا سپاہی بولا "سب جانگلیوں کو جرائم پیشہ قرار دیدینا چاہیئے"۔

اُس لڑکی نے سپاہیوں کی طرف گھور کر دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو، اور تم کہاں کے نیک ہو۔

میں نے کہا "رسمی بہت خوبصورت ہو گی"۔ اُدھر سے اس لڑکی نے تیوری چڑھائی جیسے کہہ رہی ہو، کسی بھونڈی لڑکی کے لیئے پگڑی باندھنے کو نابو ہی رہ گیا تھا؟

میں نے پھر کہا "رسمی کے بال بہت گھنیرے ہوں گے"۔

"یہ بات ہے" نابو نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اسکی باریک مینڈھیاں تمہارے سیلنوں کی طرح گوندھی ہوئی ہونگی"۔

"یہ بھی سچ"۔

"اور اس کی چوٹی جاڑے کی رات کی طرح ہو گی ـــــ کالی اور لمبی"

"یہ بھی سچ"

"ہاں تو وہ کیا کھاتی ہو گی؟"

"لال لال پیلو۔"

اور اُدھر سے کالی داڑھی والے سپاہی نے ایک گیت چھیڑ دیا۔

"کنّاں نوں سوہنے بندے سر تے بودی جھل پئی
ڈھولا میرا بوتل شراب دی وچ گلی دے ڈلھ پئی
لائی بھُل بھلاوے، گل شہریں ہل پئی
ایتھے ہیں نہ بھلّی اگے لکھّوں بھُل پئی
مینہ کسے تے جینا ایں تاں پرت مُہار نوں، میرے ہانی ڈھولا
اپنے دیساں تے، وا فضلاں دی جھُل پئی"

——کانوں میں خوبصورت بُندے ہیں، سر پہ ماتھے تک کٹے ہوئے بال لہرانے لگے
میرا ڈھولا شراب کی بوتل ہے جو گلی میں لنڈھ گئی۔
بھول بھول میں پریت لگائی، بات تو شہروں میں پھیل گئی۔
یہاں مجھ سے بھول نہیں ہوئی، پہلے لاکھوں سے یہ بھُول ہو گئی۔
کسی ٹھور ٹھکانے پر زندہ ہو تو مہار ادھر کو موڑ لو، میرے ہم عمر ڈھولا!
اپنے دیش میں فضل کرنے والی ہوا چل پڑی ہے۔

"یہ جانگلیوں کا 'ڈھولا' گیت ہے۔" کھچڑی داڑھی والا سپاہی کہہ اٹھا۔

"سے ہمیشہ مرد گاتا ہے، لیکن عورت کی زبانی۔"

"خوش رہو، پٹھے! یہاں بیٹھے بیٹھے تجھے تیری سمّی کے درشن کرا دیئے۔" کالی داڑھی والا سپاہی جانگلی کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

میں نے کہا "سمّی کے بُندے چاندی کے ہیں یا سونے کے؟"

کھچڑی داڑھی والا سپاہی بولا "چاندی کے۔ جانگلیوں کے پاس سونا نہیں ہوتا۔" ناٹو مسکرا رہا تھا، جیسے وہ اس لڑکی کو بتا دینا چاہتا ہو، سونا تو امیر پہنتے ہیں۔ سمّی شہزادی نہیں۔ تم ضرور شہزادی معلوم ہوتی ہو۔ تم ساندل بار میں چلی چلو تو سائیں کی قسم ہمارا جھمر ناچ دیکھ کر خوش ہو جاؤ۔ یہ جوبن۔ یہ روپ اور یہ سونے کی بالیاں ہر جانگلی کنواری ان بالیوں کو چھو چھو کر خوش ہوا کرے گی۔

کالی داڑھی والا سپاہی بولا "سمّی کا ڈھولا شراب کی بوتل ہے۔"

کھچڑی داڑھی والا سپاہی بولا "یہ بوتل گلی میں لنڈھ گئی۔"

میں نے کہا "آخر میں سمّی یہ بھی تو کہتی ہے کہ دیش میں فصل کرنے والی ہوا چل پڑی ہے مطلب صاف ہے۔ اب سمّی کے ماں باپ ناٹو سے اس کا بیاہ کرنے کو تیار ہیں۔"

سارا ڈبہ آلوؤں کے بورے کی طرح بھرا ہوا تھا۔ ایک کنارے پر ہم نے اپنی دنیا بسا رکھی تھی۔ کالی داڑھی والے سپاہی نے کہا "آج اماوس ہے۔"

کھچڑی داڑھی والا سپاہی بولا "اماوس نہیں، چوروں کی رات۔"

وہ لڑکی سمجھ گئی کہ سپاہی پھر سے ناٹو کو شرمندہ کرنے پر تُل گئے ہیں۔ ناحق اس

چھبیلے نوجوان کو ہتھکڑی پہنا دی گئی ہے، وہ سوچنے لگی۔ اب پورے دس سال بعد ہی وہ سمتی سے بیاہ کر سکیگا۔ اس کی آنکھوں میں غم بھی تھا، اور خوشی بھی۔ کھڑکی سے باہر وہ اتھاہ تاریکی کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ کوئی انصاف کا فرشتہ ان سپاہیوں کے کان میں یہ صدا سنائے گا کہ اس نوجوان کو چھوڑ دو اور خبردار اگر آئندہ کسی جانگلی پر ہاتھ ڈالا۔ گاڑی رک جائے گی، لیکن ڈبے سے نکلتے وقت یہ نوجوان میری طرف ایک آزاد کھلنڈری مسکراہٹ ضرور پھینکتا جائے گا۔ جنگل کی خوشگوار مسکراہٹ جس میں چاندنی رات کا ناچ گھلا ہوگا جس میں چاندی کے بندوں کی کنواری چمک سموئی ہوگی اور جس میں شراب کے آخری گھونٹ کا نشہ بھی شامل ہوگا۔ ڈھولا تو شراب کی بوتل ہے ——— اپنا بالم! اور اس خیالی نشہ میں اس نے اپنی گردن ہلائی۔ اس کی سونے کی بالیاں ڈگمگ ڈگمگ ڈول رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ "جانگلیوں کی چوریاں ایسے ہی ہیں، جیسے دلدل سوکھ جائے اور اس میں ان گنت درزیں کھل جائیں۔"

اس لڑکی نے ایک خاص انداز سے میری طرف دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو، آپ تو شاعری کر رہے ہیں۔ نانو خاموش بیٹھا تھا۔ پرے ڈبے سے مسافروں کا اکھڑا اکھڑا شور سنائی دے رہا تھا۔

سپاہیوں نے بتایا کہ جانگلی صرف چور ہی نہیں ہوتا۔ کھوجی کا کام بھی وہ بخوبی سرانجام دے سکتا ہے۔ جانگلی کھوجی، گائے، بیل، بھینس یا گھوڑے گھوڑی کے

پاؤں کے نشانات کا پیچھا کرتے کرتے سو سو دو دو سو میل تک چور کو ڈھونڈ نکالتا ہے
جانگلی چور کو جانگلی کھوجی ہی پکڑتا ہے۔ لکڑی کو لکڑی ہی کاٹتی ہے۔ کلہاڑے کا دستہ
لکڑی ہی کا تو ہوتا ہے۔

ایک اسٹیشن پر ایک سردار صاحب، جو بڑی ہاتھا پائی کے بعد ڈبے میں گھس
سکے، دھکے کھاتے کھاتے ہمارے قریب چلے آئے بیٹھنے کی جگہ کہاں تھی؟ وہ
کھڑے رہے۔

کالی داڑھی والا سپاہی بولا "ایک طرف راوی، ایک طرف چناب، بیچ میں
ساندل بار ہے۔ اِدھر بہت اناج پیدا ہوتا ہے۔"

کھچڑی داڑھی والا سپاہی بولا۔ "یہ سب نہر کی مہربانیاں ہیں۔"

میں نے کہا "کسان سب جانگلی ہونگے۔"

سردار صاحب بول اُٹھے "اس سوال کا جواب میں بھی دے سکتا ہوں۔ میری
بھی زمین ہے ساندل بار میں۔"

سپاہی ہنس دیئے۔ کالی داڑھی والے سپاہی نے کہا۔ "کہئے کہئے سردار صاحب!"
سردار صاحب کچھ جھینپ سے گئے تھے بولے "میرا گھر مالوے میں ہے۔ مالوے
کے بہت سے کسان ساندل بار میں کھیتی کرتے ہیں۔ ماجھے کے بھی بہت سے کسانوں
کو اِدھر زمینیں مل چکی ہیں۔ واہگورو کے پرتاپ سے میرے پاس پانچ مربعے ہیں۔"
پتہ چلا کہ نہر کے نکلتے ہی وہ جنگل کٹنا شروع ہو گیا تھا جو سارے ساندل بار

میں پھیلا ہوا تھا۔ کُل لائلپور، شیخوپورہ، منٹگمری اور جھنگ کے کافی حصے سب جنگل کے ڈھکے ہوئے تھے۔ اب تو صرف لفظِ "بار" ہی اس جنگل کی یاد دلا سکتا ہے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ زمانہ قدیم میں جانگلی لوگ خانہ بدوش رہ چکے ہیں۔ لیکن ادھر ایک مدت سے وہ اِس جنگل میں آباد تھے۔

سردار صاحب بولے۔ "جانگلی ہی اس جنگل کے بادشاہ تھے۔ کریل اور ون کے پیڑ پرے باندھے کھڑے تھے۔ کریل کے پکے رسیلے ڈیلے اور ون کے لال لال، میٹھے پیلو جانگلی لوگ اب بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ پیڑ بالکل ختم نہیں ہو گئے جیٹھ ہاڑ میں پیلو پکتے ہیں۔ لیکن ان کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ ڈیلے بھی پیلوؤں کے بھائی ہوتے ہیں۔ یہ بھی جیٹھ ہاڑ میں تیار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی تاثیر گرم ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "جانگلیوں کو جنگل کے کٹ جانے کا، بہت دکھ ہوا ہوگا۔"

اس لڑکی نے سردار صاحب کی طرف گھور کر دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو میں سمجھ سکتی ہوں کہ کچھ جانگلی ڈیلوں کی مانند ہوتے ہونگے اور کچھ پیلوؤں کی مانند لیکن نا بو اُن سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔

دونوں سپاہی یک زبان ہو کر بولے "کٹ گیا سو کٹ گیا اب تو وہ جنگل اُگنے سے رہا۔"

سردار صاحب اپنا سب علم انڈیل دینے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ بولے "جانگلی لوگ مویشی پالتے آئے ہیں۔ واہگورو کے پرتاپ سے اس زمین کے مربعے مالوں نے

اور ما جھے کے خاص خاص زمینداروں کو انعام میں مل گئے۔ جانگلی لوگ ہل اور درانتی کے جادو سے بے خبر تھے۔ انہیں یہ زمینیں کیسے مل جاتیں؟ سینکڑوں جانگلی ابھی تک اپنے خاندانی پیشہ میں لگے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اور زمانہ ہے جی۔ بہت سے جانگلی کھیتوں میں مزدوری کرنے کو راضی ہو جاتے ہیں۔"

نابو کو ہماری باتوں سے کچھ سروکار نہ رہ گیا تھا۔ یمّی دور تھی۔ لیکن ایک شہناز سامنے بیٹھی تھی جیسے یقین ہو چلا تھا کہ چاندی کے بُندوں کی خوبصورتی اب کہاں۔ اب تو نابو نے سونے کی بالیاں دیکھ لی ہیں۔

اگر سپاہی نہ چاہتے تو شاید سردار صاحب اب اور کچھ نہ کہتے۔ سپاہیوں کو چپ دیکھ کر وہ بولے "واہگورو کی باتیں واہگورو ہی بہتر جانتا ہے، پر اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ ساندل بار میں ہماری زمین پر پہلے زمانے میں جانگلیوں کے مویشی گھاس چرتے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "تو سردار صاحب! کبھی کبھی آپ کو یہ خیال تو آتا ہوگا۔ کہ آپ نے یہ زمین جانگلیوں سے چرائی ہے۔"

سردار صاحب نے زور کا قہقہہ لگایا۔ سپاہی خوش تھے کہ سردار صاحب کھسیانے ہو رہے ہیں۔ میں نے پھر پوچھا "یہ جو جانگلیوں میں رواج ہے۔ کہ جب تک ایک گھبرو چوری نہ کر لے اس کے سر پہ پگڑی نہیں بندھتی، اس کا بیاہ نہیں ہو پاتا، یہ رواج کتنا پرانا ہے؟"

دونوں سپاہی یک زبان ہو کر بولے "اب جواب دیجیے سردار صاحب!"

سردار صاحب گہری سوچ میں کھو گئے۔ میں نے کہا "میرا اپنا خیال ہے، سردار صاحب کہ چوری کی شرط جنگل کٹ جانے کے بعد شروع ہوئی ہوگی۔"

اس لڑکی نے داد دینے کے انداز سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، اب سمجھ میں آئی آپ کی شاعری ۔۔۔۔ دلدل سوکھ گئی تو اس میں دراڑیں کھل گئیں، جنگل کٹ گیا۔ جانگلیوں کی آزادی چھن گئی، اپنی چھوٹی چھوٹی چوریوں سے وہ اس بے انصافی کا بدلہ لینے لگے۔

اِدھر کھچڑی داڑھی والے سپاہی کا من رکھتے ہوئے میں نے کہا "چلو جی، جانگلی چور ہی سہی، ایک ڈھولا اور ہو جائے ذرا۔"

سپاہی نے اس لڑکی کی طرف گھور کر دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، مجھے معلوم ہے تمہارے خیالات کبوتروں کی طرح کس چھتنارے پر آ بیٹھے ہیں، کسی نقاضے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ گانے لگا۔

مدتاں نوں سوہنے بندے، سر تے چھتے نیرے
ایہہ لے کھاں کنگھی، میر زادیئے، انہاں نوں مُچھنڈے نال تدبیرے
اساں ہنڈاونے نال سانجھاں دے، جاں جاں ڈنڈے نے کھیرے
عاشقاں نوں بدیاں انج سوہنیاں، جویں ڈِتی تے مدھ تنیرے
تو نہ ٹر گئے توں پچھے ڈِگی، دکھ صبر دے بیڑھے

کسے لاہمہ تے جینا این تاں پرت پُہار نوں میرے ہانی ڈھولا او

اپنے وطناں تے وَسّ گئے فضلاں دے منیر ھے۔"

——کانوں میں خوبصورت بُندے ہیں، سر پہ گھنیرے بال

یہ لے کنگھی، میرزادی، میرے بالوں کو بڑی تدبیر سے سنوار دے۔

یہ بال مجھے بہت شوق سے رکھنے ہیں، جب تک یہ اونٹنی یا گائے کے دو یا ایک

دانت والے بچوں کی طرح ہیں۔

عاشقوں کو بدیاں یوں سجتی ہیں، جیسے بیل کی جڑ کے قریب تربوز۔

تیرے چلے جانے کے بعد میں گر پڑی۔ بڑے صبر سے میں نے دکھ سہہ لئے۔

کسی مقام پہ زندہ ہو تو مہار ادھر کو موڑ لو، میرے ہم عمر ڈھولا!

اپنے وطن پر فضل کرنے والے مینہ برس گئے!"

سردار صاحب کہہ اُٹھے۔ "مجھے تو ڈھولا سنتے سنتے صوفیوں کا کلام یاد آجاتا ہے،

ہمارے گورو نانک دیو جی مہاراج نے بھی اپنے بہت سے "شبد" عورت کی زبانی گائے

ہیں۔ یہی بھگتی ہے۔ بھگت ہمیشہ عورت کی بھاشا میں اپنے واہگورو کو پکارتا ہے۔"

کھچڑی داڑھی والا سپاہی بولا۔ "سردار صاحب، آپ کی زبان سے یہ باتیں

سن کر مجھے بھی جانگلیوں کے متعلق اپنی رائے بدلنی ہوگی۔ اب تک تو میں یہی سمجھتا تھا

کہ جیسے جانگلی محبوبہ کے کانوں میں بُندے لٹکتے ہیں ویسے ہی جانگلی محبوب کی زندگی

سے اس کی چوریاں لٹکتی ہیں۔"

سردار صاحب کہہ رہے تھے "جانگلی لڑکی اپنے کنوارے بالوں کو اونٹنی یا گائے کے ایک یا دو دانت والے بچّوں سے تشبیہہ دیتی ہے اور پھر کہتی ہے کہ عاشقوں کو بدیاں اُسی طرح بھلی لگتی ہیں۔ جیسے بیل کی جڑ کے قریب تربوز یہ تشبیہہ بھی اچھی ہے۔"

کھچڑی داڑھی والے سپاہی نے ٹھوکر ماری "آپ سے ملنے سے پہلے میں یہی کہتا، سردار صاحب کہ چوروں کو چوریاں اسی طرح سجتی ہیں، جیسے بیل کی جڑ کے قریب تربوز!"

ایک ساتھ تین قہقہے گونج اُٹھے۔ سردار صاحب بولے "جانگلیوں کا جُھمّر ناچ مجھے مست بنا دیتا ہے۔ گوربانی میں بھی ناچنے کی حمایت کی گئی ہے — نام سنگ اے منوا گیدھ، یعنی اے من واہگورو کے نام کے سنگ گِدّھا ناچنے والوں کی طرح ناچ لے — گِدّھا ہمارے مالوے کا دیہاتی ناچ ہے اور جُھمّر ساندل بار کا۔ جُھمّر کا رس مجھے زیادہ پسند ہے۔"

نابُو تو ہتھکڑی کے باوجود آزاد تھا۔ ہمارے کہنے بھر کی دیر تھی اس نے جُھمّر کا ایک گیت گانا شروع کر دیا جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا:

— ارے یار، بُندوں کے ساتھ

وہی بات۔ بندوں کے ساتھ

جو ساجن نے کی آج کل، یار۔ بندوں کے ساتھ۔

سات روپے کے بُندے، آٹھ روپے کے بُندے

میں نے تجھ سے کہا تھا ناکہ

ارے یار بندوں کے ساتھ

وہی بات بندوں کے ساتھ

جو ساجن نے کی آج کل، یار بندوں کے ساتھ

"چاندنی رات کا سماں تھا" نابو کہہ اٹھا" وہ دیر تک یہ گیت گاتی رہی اور پھر بولی "چاندی کے بندے نہیں ہمیشہ سے پہنتی آئی ہوں، نابو مجھے ڈیڑھ تولہ سونے کے جھمکے لادو، جیسے سچا سنگھ کی بیٹی پرسنّی کے ہیں جس کا پچھلے ماگھ میں بیاہ بھی ہو گیا اور تین دن بعد وہی جھمکے لا کر میں نے سمّی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اسے میں نے سمجھا دیا کہ ابھی انہیں ہوا نہ لگنے پائے۔ بہت جلد میرے سر پہ پگڑی بندھ گئی۔ لیکن سمّی کے ساتھ میرا بیاہ نہ ہو سکا۔ اس کا باپ تو راضی تھا۔ بھائیوں نے ضد کی۔ اور ایک روز تمریاں بج اٹھیں ــــ میرے لئے نہیں، مغلے کے لئے جس کی برات راوی کے کنارے سے آئی تھی۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا" تو اب سمّی مغلے کے ساتھ رہتی ہے ؟"

وہ بولا" اور کیا میرے ساتھ رہتی ؟ میں نے فیصلہ کیا کہ ایک بہت بڑی چوری کروں جس کے بل پر میں سمّی کو اکسا سکوں کہ وہ مغلے کو چھوڑ کر میرے ساتھ رہنا منظور کر لے۔"

دونوں سپاہی ہنسنے لگے: "بچّو دس سال تو تیرے لئے دس دن ہیں۔"

سردار صاحب بولے۔ "کیا اسے دس سال کا حکم ہو چکا ہے؟"

سامنے والی سیٹ پر اس شہناز نے بڑے فخر سے گردن ہلائی۔ اس کی سونے کی بالیاں ڈگمگ ڈگمگ ڈول رہی تھیں۔ اس نے نابو کی طرف ایک آزاد، کھلنڈری مسکراہٹ پھینکی جیسے کہہ رہی ہو "تمّی نہیں ملتی تو نہ سہی۔ میں جو ہوں، میرا باپ ایڈووکیٹ ہے تمہاری اپیل کرا دونگی، تم بری ہو جاؤ گے..... یہ سونے کی بالیاں پسند نہ ہوں تو میرے پاس ڈیڑھ تولہ سونے کے جھمکے بھی ہیں۔ چاندنی رات کا جھمر شروع ہونے سے پیشتر ہی میں خود پہن لونگی اپنے جھمکے۔

کمین گاہ

اُس وقت وہ شطرنج کے مہرے معلوم ہوتے تھے۔ ایک مرہٹہ، دو سکھ، دو گورکھے، تین بنگالی اور آٹھ اہیر، سولہ کے سولہ سپاہی دشمن کی تاک میں چھپے بیٹھے تھے۔ اہیر پیادے تھے تو گورکھے فیل، سکھ گھوڑے تھے تو دو بنگالی بنے بنائے رُخ۔ سنیل کی حیثیت اس کھیل میں بادشاہ کی تھی۔ اس کی جیت یا ہار پر اُس کی فتح و شکست کا دار و مدار تھا۔ رات کی تاریکی میں یہ ہیجان خیز کھیل کھیلا جانے والا تھا۔

دُور محاذ پر توپوں کی گرج بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ پاس کے درختوں پر کوئی پرندہ بھی موجود نہ تھا۔ جو فضا میں ایک ہلکی سی چیخ چھوڑ کر اُڑ جاتا۔

مرہٹہ بولا۔ "دن بڑھ رہا ہے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتا کہ دشمن بھاگ رہا ہے۔" جمیل سنگھ نے شہ دی۔

"اب تو دشمن کے باپ کو بھی بھاگنا پڑے گا۔" سورما سنگھ کہہ اُٹھا۔ "مجھے بس سنیل بابو کے اشارے کا انتظار ہے۔"

سنیل کی آنکھوں میں نئی چمک آ گئی۔ جمیل سنگھ اور سورما سنگھ سمجھ گئے کہ اب وہ اپنی آخری سگریٹ سلگانے کی فکر میں ہے۔ اپنی اپنی جگہ سے پرے سرک گئے۔ پورے آدھ گھنٹے سے سنیل اپنی سگریٹ کو جیب ہی میں ٹٹول رہا تھا۔ بڑے احترام سے اُس نے اسے باہر نکالا اور مرہٹہ نے دیاسلائی جلا کر اسے سلگا دیا۔ تین کش سنیل نے لگائے، ایک کش مرہٹہ کو بھی نصیب ہو گیا۔ سمجھوتہ کے مطابق اسے بجھا کر سنیل نے اُسی جیب میں رکھ لیا۔ جہاں یہ پہلے پڑی تھی۔ دُور سے دو نو گورکھے مسکرائے۔ چلو کسی طرح تمباکو کی بُو تو نصیب ہوئی۔ آٹھوں اہیر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ شاید وہ سنیل کی سگریٹ چھیننے کا قصد کر رہے تھے۔

دونوں بنگالی بہت دیر سے اُونگھ رہے تھے۔ اُنہیں غنودہ دیکھ کر ایک گورکھے کو بھی اپنی بے خوابی کا دھیان آ گیا۔ اشارے ہی اشارے میں سنیل کی اجازت مل گئی اور وہ اپنی نشست سے پرے ہٹ کر لیٹ گیا۔ سپاہیوں کی کھُسر پھُسر سے ظاہر تھا کہ اُنہیں اپنے تینوں ساتھیوں پر رشک آ رہا ہے۔ لیکن ہر کسی کو تو یوں مدہوش ہونے کی اجازت نہ مل سکتی تھی۔ یہ مقام خطرے سے خالی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اُن کی نیند آخری نیند ثابت ہوتی اور دشمن کی گولیاں اُنہیں

اس ڈربے میں بھون کر رکھ دیتیں۔

مرہٹہ بولا۔" دونوں بنگالی تو سپنے کی پگڈنڈی پر چلتے چلتے اپنی اپنی بنگالن کے پاس پہنچ گئے۔ اب یہ گورکھا بھی اپنی گورکھن سے ملنے کے لئے چل پڑا۔"

چاروں طرف سے قہقہے بلند ہوئے، لیکن سونے والے برابر سوتے رہے۔

جمیل سنگھ جو اب قریب آگیا تھا، سنیل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔" تم مت جانا اپنی بنگالن کے پاس! تمہاری غیر حاضری میں ہم اداس ہو جائیں گے۔"

"مجھ سے یہ غلطی نہ ہوگی سردار جی!" سُنیل نے جیب میں بچی ہوئی سگریٹ کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

سورما سنگھ نے قہقہہ لگایا اور کہا۔" تمہاری مرضی سُنیل بابُو، تمہاری جُوتیں تمہاری بنگالن ہی نکال سکتی ہے۔"

"پہلے اپنی جوؤں کی فکر کرو، سردار جی!" سنیل نے دائیں ہاتھ سے سر کھجاتے ہوئے کہا۔" کل سُورج نکلنے سے پہلے پہلے دشمن مزا چکھ لے گا، پُل پر ہمارا قبضہ ہو جانے کے بعد ہم دیکھیں گے کہ وہ کس طرح منی پور کا خواب دیکھ سکتا ہے۔"

گورکھا مسکرا رہا تھا۔ جمیل سنگھ بولا۔" کیوں، تو بھی سپنے ہی سپنے میں اپنی گورکھن کے مدھ ماتے نین دیکھ آنے کی بات سوچ رہا ہے؟"

سنیل نے گھور کر جمیل سنگھ کی طرف دیکھا جیسے وہ یہ پوچھ رہا ہو۔ کیوں سردار جی تمہارا ذہن کب تک لال شیشہ بنا رہے گا؟ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ سُورج کے سامنے سفید روشنی کے باقی چھ رنگ پوری طرح اس میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ اپنے

جسم میں سے کسی رنگ کو گذرنے کا راستہ دیتا ہے تو وہ صرف لال رنگ ہی کو۔ تمہارے لئے یہ لال رنگ ہے عورت کا ذکر۔ خیر کیونکہ تم اسی موضوع سے زیادہ مانوس نظر آتے ہو۔"

مرہٹہ بولا" وہ ناگا لڑکی مجھے کبھی نہ بھولے گی جس نے اپنی گائے کو ہانک کر ہمارے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ حالانکہ ہمیں دودھ کی بجائے دولتیاں ہی مل سکیں۔ اُس کی آنکھیں کیسی چمک اُٹھی تھیں اور کس طرح وہ حیرت کی زندہ تصویر بنی ہمارے سامنے کھڑی رہی"

سنیل نے مرہٹہ کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" ہم ناگا نوجوانوں کے ممنون تو تھے ہی۔ اُس لڑکی نے بھی مہمان نوازی سے موہ لیا۔ حالانکہ ہم اُس کی گائے کا دودھ دوہنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔"

جمیل سنگھ کہہ رہا تھا" ڈیماپور میں کرنل نے بتایا تھا کہ ناگا لوگ نہ اپنی گائیوں کا دودھ کبھی دوہتے ہیں اور نہ کبھی دُودھ پینے کا خواب دیکھتے ہیں جس گائے کا دودھ آجتک کسی نے نہ دوہا ہو۔ اُس کا دودھ ہم کیسے دوہ سکتے تھے؟"

شورما سنگھ نے گورکھا کی طرف آنکھیں گھماتے ہوئے کہا" اُس کی چھاتیاں چٹان کی طرح اُبھری ہوئی تھیں۔ کیوں گورکھا؟"

گورکھا بولا" میں نے سنا ہے کہ جب تک ناگا نوجوان اپنی محبوبہ کے پاس انسانی سر کاٹ کر نہیں لے جاتا۔ وہ اُسے اس قابل نہیں سمجھتی کہ اُس کی محبت کا حقدار بن سکے"

مرہٹہ کہہ رہا تھا" اِس سال کوئی ناگا دوشیزہ کنواری نہ رہی ہوگی۔ ناگا نوجوان خوش ہو ہو کر اپنی اپنی محبوبہ کو انسانی سروں کا نذرانہ پیش کرتے چلے گئے ہونگے۔"

جیمل سنگھ نے پہلے سنیل کی طرف دیکھا، جیسے وہ اس کی اجازت کے بغیر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالنا چاہتا ہو۔ اور پھر مرہٹہ کی طرف آنکھیں گھما کر کہا: "اُس ہیر کا رانجھا ضرور کسی جاپانی لفٹننٹ کا سر کاٹ کر لایا ہو گا۔"

اپنے ساتھیوں کو جیمل سنگھ نے ہیر رانجھے کا قصّہ سنا ڈالا اور بات کو پھر سے ناگا لڑکی کی طرف گھماتے ہوئے اُس نے وارث شاہ کا ایک شعر سنایا۔

"جھاک دے کے باغ بہشت والی سانوں چلّی ایں کلّریں چھوڑ ہیرے"

—— باغِ بہشت کی جھلک دکھا کر، اے ہیر، تو ہمیں اس کلّر والی زمین پر چھوڑ کر بچھڑ رہی ہے،

اُس نے اپنے ساتھیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اُس ناگا لڑکی کے والدین نے ہیر کے ماں باپ کی طرح زبردستی نہ کی ہو گی اور ناگا نوجوان کو رانجھے کی طرح مایوس ہونے کا موقع نہ ملا ہو گا۔

درختوں سے چھن کر دھوپ نے سامنے کی پگڈنڈی کو کچھ اس طرح مزیّن کر دیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کوئی کوڑیالا سانپ رینگتے رینگتے رک گیا ہے۔

سنیل خوش تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے دشمن پر چھاپا مارنے میں کامیاب ہو جائیگا اور پھر یونہی وہ پل اُن کے قبضہ میں آ جائے گا۔ منی پور کا نصف سے زیادہ خطرہ دور ہو جائیگا۔ اُس کے ساتھی اُس کی چال سُن کر عش عش کر اُٹھے تھے۔ اس پر اس کے چار ہفتے صرف ہوئے تھے۔ اُسے محسوس

ہوا کہ یہ خوشی کا احساس اور نگار خانے میں بیٹھ کر تصویر تیار کرتے وقت کا احساس ایک جیسا ہے۔

اُسے بہت پہلے کا زمانہ یاد آگیا جب اُس کے دوست اُسے بے اُستاد کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ اُس کی تخلیقی قوت، جو ایک اژدہا کی سی مہینوں لمبی نیند کے بعد نئے سرے سے اپنے گرد وپیش کا جائزہ لے رہی تھی، فن مصوری اور سنگتراشی میں نئے تجربات کی حامی تھی۔ وہ ڈرتا نہ تھا کہ دوسرے مصوّر اور سنگتراش کیا کہیں گے۔ وہ چاہتا تو شانتی نکیتن ہی میں بیکار رہتا۔ لیکن وہ چل پڑا۔ گھوم پھر کر اُس نے اجنتا اور ایلورا کے فن کاروں کا فن دیکھا۔ سنگتراشی کے پرانے نمونے اُسے فن کی نئی نئی حدود عبور کرنے پر اُکساتے رہتے۔ پیر کا چکّر اُسے جگہ بہ جگہ گھماتا گیا۔ حتیٰ کہ منی پور پہنچ کر اُس نے اپنے فن کو سمجھایا بہت دیکھ لی دُنیا باورے، اب کچھ روز یہیں جم جاؤ اور اگر دنیا کو دینے کے لئے تمہارے اندر کچھ ہے تو اُسے باہر نکالو۔

مرہٹہ بولا۔ "کیا سوچ رہے ہو سنیل بابو؟ تم حکم دو تو ایک ہی پھونک سے دشمن کے دیئے بجھا دوں۔"

سنیل کا دل زور سے اُچھلا اور وہ بولا "موقع آنے دو مرہٹہ!"

ایک بار پھر سنیل اُسی یاد کی رَو میں بہا جا رہا تھا۔ اُن دنوں سچ مچ اُس کی حالت ایک حاملہ عورت کی سی تھی، جسے ہمیشہ یہ دھیان رہتا ہے۔ کہ وہ دن نزدیک آرہا ہے، جب وہ اپنی تخلیق سے دنیا کا تعارف کرائے گی —— یہ میری کوکھ کی اپج ہے، بجائے خود

ایک پوری نسل ـــ اور اس میں ایک پوری نسل کی ماں بننے کی اہلیت ہے... منی پوری رقص کی تصویریں بناتے وقت اُسے محسوس ہوتا کہ قدیم ہندوستان نئے ہندوستان کو جنم دے رہا ہے۔ ایک بار خود منی پور کی شہزادی نے بھی اُسے اپنے ہاں کھانے پر بلایا تھا رات کا وقت تھا۔ تاروں کی چھاؤں میں منی پوری کنیائیں ناچ رہی تھیں۔ اُس کی درخواست پر خود منی پور کی شہزادی بھی اس رقص میں شامل ہوئی اور اُسے محسوس ہوا تھا کہ وہ تو چترانگدا ہے جسنے اپنے ارجن سے کہا تھا کہ وہ اُس سے بیاہ کرنے تو کچھ ہی دنوں میں ایکدوسرے ارجن کو اُس کے روبرو کھڑا کر دیگی۔ بعد ازاں اُس نے شہزادی کا سنگ مرمر کا مجسمہ تیار کیا تھا تو اُسے ریاستی حلقوں میں وہ توقیر حاصل ہوئی جس پر صرف ایک فن کار ہی کا حق ہو سکتا ہے کسی اور کا نہیں۔ وہ اسے بیچنے پر رضامند نہ ہوا تھا۔ اُس نے صاف کہدیا تھا کہ اگر شہزادی چاہے تو وہ اُسے مفت دے سکتا ہے لیکن کسی بھی قیمت پر بیچنا فن کی ہتک ہو گی۔

جیمل سنگھ اور سورما سنگھ بیٹھے بیٹھے اپنے اپنے گھر کے سامنے جا نکلے تھے، جہاں اُن کے ننھے ننھے بچّے اپنے ہمجولیوں پر دھول کی مٹھیاں بھر بھر کر پھینک رہے تھے جہاں گیلے اُپلوں کے دھوئیں کی بُو تیز سے تیز تر ہو رہی تھی؛ جہاں بازیب کے شرمیلے سُر حسن و عشق کی اٹھکیلیوں پر پچی کاری کرتے نظر آ رہے تھے۔

گورکھا بولا۔ "جنگ ختم ہوتے ہی نیپال چلا جاؤں گا۔"

مرہٹہ کہہ رہا تھا۔ "دشمن کی نصف سے زیادہ طاقت تو ہم کل صبح تک ختم کر دینگے۔

اب یہ جنگ نیا رُخ اختیار کریگی۔ بس پُل پر ہمارا قبضہ ہو جائے ذرا"

جیمل سنگھ اور سورما سنگھ یک زبان ہو کر بولے۔ "سنیل بابو کو بہت بڑا خطاب ملیگا۔ گورکھا!"

گورکھا خوش تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "میں نیپال جاؤنگا، تم بھی میرے ساتھ چلنا سردار جی۔"

مرہٹہ نے شہ دی "کون سردار جی — جیمل سنگھ یا سورما سنگھ؟"

"دونوں اور تم بھی مرہٹہ!"

"میں بھی؟ — ہاں میں نیپال چلوں گا۔ کیسا ہے تمہارا نیپال؟"

"منی پور سے اچھا ہے نیپال۔"

"اور مہاراشٹر بُرا ہے منی پور سے؟"

جیمل سنگھ کہہ اُٹھا۔ "وعدہ رہا، میں نیپال چلوں گا، گورکھا!"

مرہٹہ بولا۔ "میں کہتا ہوں۔ تم تینوں مہاراشٹر چلنا۔ بلکہ سنیل بابو کو بھی لے چلیں گے

وہاں بہت دُودھ ملتا ہے۔"

سنیل نے غیر جانبدارانہ طور پر اپنے ساتھیوں کی باتیں سنیں، اُسے معلوم تھا کہ دودھ مل جائے تو یہی نیپال ہے، یہی مہاراشٹر ہے۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے منی پور کی شہزادی کا مجسمہ بناتے ہوئے ایک دن بڑے احترام سے کہا تھا "شہزادی تیری باتیں تو تازہ دودھ کی دھاریں ہیں، انکے برعکس میری باتیں کڑھے ہوئے دودھ کا درجہ رکھتی ہیں۔ جب دو قسم کے دودھ آپس میں ملا دیئے جائیں اور تجربہ کار ہاتھ جگہ جگہ ان کی مخصوص مقدار ڈالکر دہی جما دیں تو کیسے پتہ چل سکتا ہے۔ کہ اس میں کہاں

کہاں تازہ دودھ نے مدد دی ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا، یہ اپنا مجسمہ بھی تم خود تیار کر رہی ہو یا یوں کہو کہ میری تخلیقی قوت میں تم نے ہی اتنی روح پھونکی ہے کہ میں فنِ سنگتراشی کا یہ تجربہ کر رہا ہوں۔" اور اس کے جواب میں شہزادی صرف مسکرا دی تھی۔ اُس نے فن کی جو خدمت کی تھی۔ اُس سے اُس کے ساتھی یکسر ناواقف تھے۔ جب جمیل سنگھ اور سورما سنگھ رنگیلے گیت گانے، یا جب اہیروں کا نشیلا برہا بلند ہو اٹھتا تو وہ کئی بار سوچتا کہ انہیں بتا دے، اُن کے قریب ایک فن کار بیٹھا ہے۔ اگرچہ آج اُس کے ہاتھ میں بندوق ہے برش نہیں، چھینی نہیں۔

آسمان کسی قدر دھندلا نظر آتا تھا۔ توپوں کی گرج برابر سنائی دے رہی تھی۔ اونچی چٹانیں، جن کی آڑ میں وہ چھپے بیٹھے تھے، فخر سے سر اٹھائے کھڑی تھیں اور سونے والے بدستور سو رہے تھے۔

آٹھوں آہیر بھی اونگھتے نظر آتے تھے۔ بڑے اطمینان سے سنیل نے اپنے ہاتھوں سے ایک ایک آہیر کو لٹا دیا۔ یہ اُس کی شفقت تھی اور اب سونے والوں کی تعداد تین سے بڑھ کر گیارہ تک جا پہنچی۔

پھر وہی یادوں کا دریا بہنے لگا۔ سنیل کو اپنے نگار خانے کا دھیان آیا جو اُس نے منی پور میں تعمیر کرایا تھا۔ اُس کی افتتاحی رسم ادا کرتے ہوئے شہزادی نے اُسے کتنا بڑا خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ "سنیل کے فنِ مصوری نے منی پوری رقص کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے۔ یہ نگار خانہ اجنتا اور ایلورا کی طرح تاریخی اہمیت حاصل کرے گا، کم از کم مجھے تو

یقین ہے۔" کئی برس تک وہ فن کی خدمت میں مصروف رہا۔ شہزادی برابر اُسے اپنی سرپرستی سے فیضیاب کرتی رہی۔ کئی بار وہ اُسے روکتا۔ لیکن وہ کہتی "یہ نگار خانہ نہیں، مندر ہے!"

...... پھر جنگ کے بادل گھر آئے۔ حتیٰ کہ رنگ ملنے بھی کٹھن ہو گئے۔ وہ برابر کسی نہ کسی طرح اپنے راستے پر گامزن رہا۔ بلکہ سنگتراشی کی طرف اُس کا جو ہر قابل آخری گہرائیوں کو چھو رہا تھا۔ ادھر جنگ نے زور پکڑ لیا۔ دشمن کے ہوائی جہاز آتے اور بم برسا کر زندگی کے منہ پر موت کی سیاہی مل کر واپس چلے جاتے۔ اُسے اتنی فرصت نہ تھی کہ روزانہ اخبار بھی پڑھتا۔ اب کئی بار شہزادی جنگجو سپاہیوں کی تعریف شروع کر دیتی۔ وہ اس پر جھنجلاتا اُس کا خیال تھا کہ شہزادی ایک جذباتی قسم کی لڑکی ہے۔ اُس کی یہ انتہا پسندی اُسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ جس روز اس نے شہزادی کو بتایا تھا کہ اُس کے چاروں بھائی فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں۔ شہزادی نے خوب زور سے تالی بجائی تھی، جیسے وہ فنکار کا مذاق اڑا رہی ہو، بیٹھے چاٹتے رہو فن کو، دشمن طاقت پکڑ گیا تو وہ ہمیں سنگھاڑوں کی طرح بھون کر کھا جائیگا۔

اُس نے بارہا شہزادی کو یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ سپاہی کا کام کتنا آسان ہے۔ توپ میں گولا ڈالا اور چلا دیا۔ اُس کے سامنے جو بھی آیا۔ جھٹ موت اور تباہی کے منہ میں چلا گیا۔ اس کے برعکس میں ایک حسینہ کی نوک پلک درست کرنے میں چھ ماہ صرف کر سکتا ہوں۔ میں نے منی پوری رقص دیکھا ہے، اس کی خوبصورتی کو اُبھارا ہے۔ اسکی روح کو جلا دی ہے۔ یہ درست ہے کہ میرے بھائی اب بڑی بڑی تنخواہوں پہ کام کر

رہے ہیں۔ میں اُن سے مختلف ہوں۔ سپاہی بننے کے لئے ایک خاص قسم کا آدمی درکار ہے۔ طاقت اور حوصلہ اُس کے دو بڑے ہتھیار ہیں۔ جسمانی مشقت اُس کا آدرش ہے دماغی مشقت نہیں۔ شہزادی سامنے بیٹھی ہنستی رہی۔

پھر ایک روز بمباری ہوئی۔ سنیل کا نگار خانہ بھی تباہ ہو گیا۔ خوش قسمتی سے وہ اس وقت شہزادی کے ہاں دعوت کھا رہا تھا۔ اُس حادثہ نے اُس کی دنیا بدل کر رکھ دی تھی۔ وہ سب شاہکار اب کہاں تھے۔ جنہیں ہندوستانی فن کو زندہ رکھنا تھا؟ وہ کہہ رہا تھا۔ "بھلا میں نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا تھا۔ شہزادی میں نے تو آج تک بندوق بھی ہاتھ میں نہیں پکڑی۔ میں کتنا معصوم ہوں، کتنا مسکین! آج تک میں نے کسی پرندے تک کو زخمی نہیں کیا۔"

پھر ایک روز اُس نے فوج میں نام لکھا لیا۔ شروع شروع میں اُسے یہ زندگی بہت کٹھن معلوم ہوئی۔ لیکن اُسے اس سے مانوس ہوتے دیر نہ لگی۔ جوں جوں وہ زیادہ دلچسپی لیتا گیا۔ اُسے معلوم ہوا کہ موجودہ زمانے کی جنگ بھی ایک فن ہے۔ اُسے اُس خط کا مضمون لفظ بہ لفظ یاد تھا جو اُس نے فوج سے پہلی بار شہزادی کو لکھا تھا۔ "فنکار سپاہی بننے کے لئے جوہر قابل چاہیئے۔ ایک جاہل بیوقوف کسان یا مزدور صرف سپاہی بن سکتا ہے، فنکار سپاہی نہیں۔ جیسے ایک فنکار بُرش کا استعمال کرتا ہے یا سنگتراش چھینی چلاتا ہے۔ اُسی طرح فنکار سپاہی تلوار یا بندوق کا استعمال کرتا ہے، توپ اور بم چلاتا ہے جیسے عوام ان گنت ہوتے ہیں اور فنکار اِکّا دُکّا، اسی طرح عام سپاہی جتنے چاہو مل

جائیں گے اور فنکار سپاہی مشکل سے سو میں پانچ نظر آئیں گے۔ دشمن کو دھوکا دینا، اُسے نرغہ میں ڈالنا، تھوڑے آدمیوں کی مدد سے زیادہ آدمیوں کو پسپا کرنا، موقع پر پیچھے ہٹ جانا، ایک طرف اشارہ کر کے دوسری طرف دھاوا بول دینا بلکہ یہ کہو کہ جنگ پر پہنچنے سے پہلے ہی نقشہ پر ہی جنگ جیت لینا ـــــ یہ صرف ایک فنکار سپاہی کا کام ہو سکتا ہے۔" اس کے جواب میں شہزادی نے اُسے لکھا تھا۔ "تم نے مزیدار باتیں لکھی ہیں لیکن ابھی تک سپاہی بننے کی معقول وجہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ آج انسانیت خطرے میں ہے، فن خطرے میں ہے، حُسن خطرے میں ہے۔ عشق بھی خطرے میں ہے۔ آج فنکار کا امتحان ہو رہا ہے۔ مِنی پور، مِنی پوری رقص، مِنی پوری کنیائیں، جنہیں یہ رقص ورثہ میں ملا ہے، سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ تم ہماری مدد کر رہے ہو۔ میں تمہاری ممنون ہوں۔"

سنیل کے بازو اکڑے ہوئے تھے۔ جیسے لوہے کی سلاخوں کو بھٹی میں سُرخ کرنے کے بعد پانی میں ڈال کر ایک دم باہر نکال لیا ہو۔ اب لوہا پہلے سے سخت ہو گیا تھا۔ صرف بازو ہی کیوں اُس کا تمام جسم اب آہنی بن چکا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ فن کو تباہ ہونے سے بچا لے گا۔ حُسن اور عشق اور رقص کبھی ختم نہ ہونگے۔

سونے والوں کے خرّاٹے دھونکنی کی طرح، فضا کو چیر رہے تھے۔ گورکھا نے تحقیر آمیز نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، یہ لوگ دشمن پر کیا چھاپا ماریں گے؟ جن ہاتھوں سے سنیل نے اہیروں کو لٹایا تھا۔ اُنہی ہاتھوں سے اُس نے انہیں جگا کر بٹھا دیا، جیسے ہپناٹزم کا عمل ختم ہونے پر وہ خود بخود اُٹھ بیٹھے ہوں۔

جیمل سنگھ نے چٹکی لی۔"کیوں یارو ہو آئے اپنی اپنی اہیرن کے پاس۔"

سورما سنگھ بولا۔"اپنی اہیرنوں کے پاس بیچاروں نے خود ہی اپنی بہادری کی تعریف کی ہوگی۔"

گورکھا نے شہ دی۔"اہیرنوں سے پنجابنیں زبردست ہوتی ہیں۔"

مرہٹہ نے بات کا رُخ بنگال کی طرف موڑ دیا۔"حسن بنگالن کا اور سب جھوٹ۔"

سنیل کی آنکھوں میں اپنا نگار خانہ پھر گیا، جہاں اُس نے بنگال کی زندگی کے کئی منظر آویزاں کر رکھے تھے۔ ہر کہیں بنگالی عورت مرد کے پیش پیش دکھائی دے گئی تھی جس نے سنیل کے فن میں نئی روح پھونکی تھی۔ وہ تھی منی پور کی شہزادی ایک بار پھر اُسے خیال آیا کہ ساتھیوں کو اپنی کہانی سنا ڈالے۔ لیکن وہ خاموش رہا۔

جیمل سنگھ کہہ رہا تھا۔"کاش، وہ ناگا لڑکی اپنی گائے کو ہانک کر پھر یہاں لے آئے ایکبے ہم اُس کی دولتیاں نہیں کھائیں گے۔"

سورما سنگھ نے بڑھاوا دیا۔"لیکن گائے کو وہ یہ جا تے یا ہمیں دودھ پیتے دیکھ کر اب اُسے حیرت نہ ہوگی۔"

جیمل سنگھ نے پلٹ کر کہا۔"میری بھوک تو اس کی چٹان کی طرح ابھری ہوئی چھاتیوں کو دیکھ کر ہی مٹ جائے گی۔"

مرہٹہ نے بڑے اطمینان سے سنیل کی طرف آنکھیں گھمائیں اور کہا۔"تمہارا کیا خیال ہے سنیل بابو، کل ہم مچھلی کسر نکالیں گے۔ خوب کھائیں گے۔ خوب سوئیں گے۔"

آٹھوں آہیر حیران تھے کہ سنیل نے اُنہیں اتنی جلدی کیوں جگا دیا۔ سوئے رہتے تو بھوک اور پیاس کا دکھ بھولا رہتا۔

پگ ڈنڈی کا رُخ بدل چکا تھا۔۔۔ دوپہر کا کوڑیالا سانپ اب کہیں نظر نہ آتا تھا! لیکن دور سے توپوں کی گرج برابر سنائی دے رہی تھی۔

"یہ کیسی زندگی ہے! دودھ نایاب، پانی نایاب، تین دن کی بھوک پیاس۔" مرہٹہ کہہ رہا تھا "یہ ٹھیک ہے سنیل بابو، کہ اب، یہ زندگی تمہاری ہے۔ کیونکہ اُس روز تم ہمیں نہ بچاتے تو دشمن کی گولیاں ہمارے سینوں میں سوراخ کر دیتیں، لیکن میں پوچھتا ہوں بھُوک پیاس سے مر جانا کہاں کی بہادری ہے؟"

بجھی ہوئی سگریٹ اب سنیل کی ہتھیلی پر پڑی تھی۔ مرہٹہ نے دیا سلائی جلائی اور سنیل نے سگریٹ کو ہونٹوں میں اٹکا لیا۔ جیمل سنگھ اور سورما سنگھ کافی دور بیٹھے تھے۔ انہوں نے تینوں سونے والوں کو جگا دیا۔ کیونکہ تمباکو کی بُو تازہ دم ہونے کی تلقین کر رہی تھی۔ تین کش سنیل نے لگائے، ایک کش مرہٹہ کو بھی مل گیا اور پھر بڑے اطمینان سے اسے بجھا کر سنیل نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"میرے جی میں آئی تھی کہ اُس ناگا لڑکی کے گرم گرم بوسے لے لوں۔" جیمل سنگھ کہہ رہا تھا۔ "لیکن سنیل بابُو کے ڈر سے میں نے اپنے من کو سمجھا لیا۔"

"نہ سمجھاتے تو پٹتے۔" مرہٹہ کہہ اُٹھا۔ "ہم نے تمہاری کچھ مدد نہ کی ہوتی۔ ناگا لوگ یہ برداشت نہیں کر سکتے۔"

"بوسوں سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔" سورما سنگھ نے اپنی تان چھیڑ دی۔ "بھوکے کو چاہئیں دو روٹیاں ـــ دو بوسے نہیں۔"

"اُس کی گائے کا دودھ کتنا میٹھا تھا۔" جمیل سنگھ نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "ایسا دودھ تو کبھی پنجاب میں بھی نہیں پیا تھا۔"

مرہٹہ کہہ رہا تھا۔ "عورت چاہے دشمن کی ہو، اُس کی حفاظت کرو۔ سیواجی مہاراج بھی یہی کہہ گئے ہیں اور ناگا لوگوں نے تو ہماری بہت مدد کی ہے۔"

ہاتھی کی طرح چنگھاڑنے والی توپیں خاموش ہو چکی تھیں۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں لوٹ آئے تھے۔ سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سینل اپنے ساتھیوں کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شہزادی کتنی خوش ہوگی۔ جب اُسے معلوم ہوگا کہ اس جنگ کی کامیابی کا سہرا میرے سر پہ بندھا ہُوا ہے . . . چلتے چلتے اُس نے سگریٹ کا بچا ہُوا ٹکڑا سلگایا۔ اب پُل سامنے تھا۔

ستلج پھر بپھرا

اِن جنونی لوگوں کی باتوں پر اُنہیں غصّہ آ رہا تھا۔ کبھی کوئی بڑا بوڑھا یوں بول اُٹھتا، جیسے پھٹا ہوا ڈھول ڈھپ ڈھپائے، کبھی کوئی ایسی آواز اُبھرتی جیسے گیلا پٹاخہ پھٹ جائے۔ ستلج اُن کا منہ چڑا رہا تھا۔ لیکن بڑے بوڑھے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے کھڑے تھے۔ بچّوں کے لئے یہ ہلڑ مچانے کا موقعہ تھا۔ ادھیڑ عمر کے لوگ کسی طرح اپنی گھبراہٹ کو ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ اُنیسوں رات سے پانی کا زور بڑھ گیا تھا۔ لیکن پیر گاؤں میں نہ تھا۔ بڑے بوڑھے کہہ رہے تھے۔ بس پیر کے آنے کی دیر ہے اُسے دیکھتے ہی ستلج شرافت سے پیچھے ہٹ جائے گا۔ اس شور میں نوجوانوں کی آوازیں الگ نوعیت رکھتی تھیں۔

سکھی چند تو خیر اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ لیکن نیرجا کے لئے یہ منظر نیا تھا۔ وہاں کھڑے کھڑے اُسے وہ باتیں یاد آئیں جو اُس نے کالج کے لان میں بیٹھے بیٹھے سکھی چند سے سُنی تھیں۔ تیری بات دوسری ہے نیرجا، کیونکہ تو ابھی ستلج سے باتیں نہیں کر پائی تو نے ستلج کو دیکھا ضرور ہے۔ لیکن ریل کے ڈبے میں سے۔ اتنے بڑے بڑے دریا سے تو نہایت ادب سے ملنا چاہیئے۔ آرام سے کنارے پر بیٹھے رہو۔ گھنٹوں پانی کی طرف دیکھتے جاؤ۔ جب کہیں کوئی اُس کا رازداں بن سکتا ہے۔ لیکن ریل کے ڈبے میں سے اس کی طرف دیکھ کر تم کیسے اس کا راز پا سکتی تھیں؟ ..... اور اس کے جواب میں اُسے خاموش پا کر سکھی چند نے پھر کہا تھا ـــــ ستلج کی پرانی عظمت اب کہاں نیرجا؟ بہت سا پانی نہروں میں چلا جاتا ہے۔ وہ بھی بُرا تھوڑی ہے۔ کھیت سیراب ہوتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں ستلج اسی طرح غریب ہوتا چلا گیا تو ایک روز بیچارے کا دیوالہ پٹ جائیگا.....

سکھی چند نے سگرٹ سلگائی۔ نیرجا پرے ہٹ گئی۔ لیکن اس وقت اُسے تمباکو ہی سے نہیں اپنے وجود سے بھی نفرت ہونے لگی تھی۔ کاہے کو وہ ادھر چلی آئی؟ آرام سے لاہور میں رہتی۔ روز نیا جوڑا باندھ کر نکلتی رہتی سے نئی ساڑھی پہنتی انار کلی میں مسکراہٹیں بکھیرتی۔ اُس کا خیال کتنا غلط نکلا۔ تُف ہے ستلج پر، ستلج کے پانیوں پہ۔ پھر کہا جاتا ہے ستلج غریب ہے......

سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے سکھی چند نے نیرجا کے قریب ہونے کی کوشش کی

اور کہا۔ "اِن جنونی لوگوں کو ہم نہ سمجھا سکیں گے نیرجا۔"

پانی کا زور بڑھ رہا تھا۔ بڑے بوڑھے، جو بدستور دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے کھڑے تھے، بُت معلوم ہوتے تھے (بچوں کا ہلڑ کسی قدر دھیما پڑ گیا تھا۔ ادھیڑ عمر کے لوگ بپر کا انتظار کرتے کرتے اُوب گئے تھے۔ نوجوان نیرجا کے جوڑے کی طرف گھور رہے تھے یہ وہ جوڑا نہ تھا جسے نیرجا خود باندھ سکتی۔ اسے وہ ہمیشہ کی طرح ماں سے بندھوا کر لائی تھی۔ پہلے موٹی مینڈھیاں گوندھی جاتیں، پھر انہیں پھرتیلی ہوشیار اُنگلیاں فنکارانہ انداز سے یہ شکل دے دیتیں۔ سکھی چند کو خیال آیا کہ گاؤں کے ایک ایک نوجوان سے نیرجا کا تعارف کرائے اور صاف صاف بتا دے کہ اُس کا جوڑا بنگالی روایت کا حامی ہے۔ اور یہ بھی بتا دے کہ اُس کی رگوں میں پنجابی اور بنگالی خون مل کر بہہ رہا ہے۔

نیرجا کو اپنے بوڑھے پروفیسر کا دھیان آیا۔ جو ہمیشہ اس بات پر زور دیتا کہ ہندوستانی موسیقی پر یونانی اثر غالب ہے۔ اُسے اپنا لمبا قہقہہ بھی یاد تھا جو ایک بار بوڑھے پروفیسر کا مذاق اُڑاتے ہوئے اُس کے ہونٹوں سے پھوٹ نکلا تھا اور اُس نے شرارتی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "جب تو جناب کل کو یہ بھی کہیں گے کہ ہماری کوئل پر کسی یونانی پرندے کا اثر غالب ہے۔" اور اس پر ساری کلاس کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ سب لڑکے اسے ایک مورتی سمجھتے تھے جسے ابھی ابھی کسی بُت ساز نے نمائش میں لا رکھا ہو۔ اپنے جھمکوں کی تھرکن سے وہ ہمیشہ

سکھی چند کو اپنی طرف متوجہ کیے رہتی۔ اور نیرجا جو اس پنجابی باپ اور بنگالی ماں کی بیٹی کو دوغلی کہنے سے باز نہ آتا۔ اس کا سب سے بڑا حاسد تھا۔

سکھی چند کو نیرجا کا خیال آیا جیسے وہ جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہو، اور انکی طرف ایک طویل قہقہہ پھینکنے والا ہو۔ جب وہ بھی اس سے کہتا کہ نیرجا خوب گاتی ہے، وہ جی کھول کر زہر اگلتا اور کہتا ہندوستان کی غلامی کا سب سے بڑا سبب اس کی موسیقیانہ دلچسپیاں ہیں۔ اس نے سوچا اچھا ہی ہوا کہ اس موقعہ پر جب کہ سارا گاؤں خطرے میں ہے کسی کو گانے کا خیال نہیں آسکتا، نہ نیرجا کسی فلمی نغمے کی دھن گنگنانے کی حماقت کر سکتی ہے۔

یہ شور بھی تو ایک بے سرا نغمہ تھا۔ بار بار کچھ سر اونچے اٹھ جاتے۔ نیرجا حیران تھی کہ جب لوگوں کا شور پانی کو نہیں روک سکتا، تو اکیلے پیر کی دعا کیسے ایک کامیاب ٹونا بن کر پانی کا زور گھٹاتی چلی جائے گی۔ مسلمان اور ہندو سب پیر کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ سکھ اس ہجوم سے پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے جیسے انہیں پیر پر اعتقاد نہ ہو۔

انہی اپنی بہی کو دوکانوں پر چھوڑ کر گاؤں کے بنیے بھی چلے آئے۔ ایک جگہ کھڑے ہو کر وہ بھی اس آفت کا جائزہ لینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی سکھوں کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ شاید سب سے زیادہ خطرہ انہیں کو محسوس ہو رہا تھا پھر سکھوں کے گروہ سے الگ ہو کر وہ بڑے ہجوم کے قریب سرکنے لگے۔

"رام، رحیم، گورو میں کچھ بھید نہیں"، ایک بوڑھا بنیا کہہ رہا تھا، "شردھا چاہیئے شردھا، پجاری، پیر، گرنتھی سب اُسی کے ہیں، اُسی کے گن گاتے ہیں"۔ وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر سکھی چند کے قریب آکر بولا "لاہور سے کب آئے تھے بیٹا؟"

"کل رات" سکھی چند نے چلا کر کہا۔

نیرجا سمجھ گئی کہ بابا بڑھاپے میں بہرے ہو رہے ہیں۔ بابا نے نیرجا کو دیکھا اَن دیکھا نہ کیا کیونکہ ابھی اُس کی نگاہ قائم تھی۔ سکھی چند کے سر پر وہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "اور یہ کنیا کنواری؟"

"اِس کے پتا ایک پنجابی سنگیت آچاریہ ہیں، بابا، اور اس کی ماتا ہے خاص ڈھاکے بنگالے کی، خاص ڈھاکے بنگالے کی بٹیا۔ وہ بڑی نیک اور شریف عورت ہے۔

— ہاں بابا"

"تو اس کے پتا کو ذرا ڈر نہ لگا؟ میں نے تو سنا ہے کہ ڈھاکے بنگالے کی استری پردیسی کو مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دیتی ہے۔ تو یہ کوئی اچھی بنگالن ہوگی بٹیا! کیا نام ہے اس کنیا کنواری کا"

"نیرجا!"

"یہ بھی کوئی ڈھاکے بنگالے کا نام معلوم ہوتا ہے۔ اب کہاں ہیں اِس کے ماتا پتا بٹیا؟"

"لاہور میں ہیں بابا۔"

"تو وہ بنگالن بہت دیاوان نکلی۔ پردیسی کو اپنی غلامی میں رکھنے کی بجائے خود اُس کی غلام ہوگئی۔ لاہور میں ہی جنم ہوا تھا اس کنبا کنواری کا؟"

"ہاں بابا۔ لاہو ہی میں اسے ستلج سے باتیں کرنے کا شوق تھا بابا لیکن ستلج کو نامہربان دیکھ کہ وہ اپنی بھول پہ پچھتا رہی ہوگی۔"

"پچھتانے سے کیا لابھ؟ پیر کے آنے کی دیر ہے پانی پیچھے ہٹ جائے گا۔ پچاس سال سے تو میں اسے پیر کے حکم میں بندھا ہوا دیکھ ہی رہا ہوں۔"

بابا نے دیکھا کہ سکھوں کا گروہ بھی بڑے ہجوم میں شامل ہو چکا ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا اُس نے سوچا ایک کا خطرہ سب کا خطرہ، اتفاق بڑی چیز ہے۔ پیر بھی آ رہا ہوگا۔ رات کا بھیجا ہوا آدمی صبح سے دو گھنٹے پہلے ہی پیر کے پاس جا پہنچا ہوگا اور وہاں سے چلنے میں پیر نے دیر نہ کی ہوگی۔

پرے ایک بچہ رو رہا تھا۔ اُس کے ساتھی نے اسے دھکا دے دیا تھا۔ بابا نے پاس جا کر اُسے اٹھایا اور اپنی جیب سے گڑ کا چھوٹا سا ٹکڑا نکال کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ بچے کی سسکیاں جھٹ رُک گئیں۔ اُس کا شرارتی ساتھی جو قریب ہی کھڑا تھا، للچائی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا، جیسے کہہ رہا ہو، اگر گرنے کا انعام گڑ کا ٹکڑا ہو سکتا ہے تو لو میں کھڑا ہوں لو مجھے بھی گرا دو۔ اور بیتر جانے سوچا کہ سکھی چند بھی اُسے گرا کر بابا سے گڑ حاصل کر سکتا ہے۔

"یوں کب تک کھڑی رہو گی نیرجا؟" سکھی چند کہہ رہا تھا میں جانتا ہوں، بابا کی باتیں تمہیں اچھی نہیں لگیں۔ بزرگوں کی باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں نیرجا۔"

"اچھی کیوں نہیں لگیں بابا کی باتیں۔" نیرجا نے غصہ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "بابا سے کہیں زیادہ تو مجھے تم پر غصہ آ رہا ہے۔ بابا نے تو صرف اتنا ہی پوچھا تھا اور یہ کنیا کنواری۔ اس کے جواب میں اتنا ہی کہہ دیا ہوتا کہ یہ کپور صاحب کی بیٹی ہے اور ہم کالج میں ساتھ ساتھ پڑھتے ہیں اور اب وہ ستلج کے درشن کرنے چلی آئی ہے اس طرح بات یہیں ختم ہو جاتی۔ لیکن ڈھاکے بنگالے کا ذکر چھیڑ کر تم نے بابا کی حیرت کو دعوت دی۔ یہ سب شرارت تھی۔"

"بڑھاپا سر پہ آ پہنچا، لیکن تم نے دیکھا نیرجا کہ بابا کے من پر ابھی تک کنیا کنواری سوار ہے۔" سکھی چند نے صفائی پیش کی۔ "ڈھاکے بنگالے کے ذکر کی دیر تھی تم نے دیکھا بابا کہاں سے کہاں جا پہنچا۔"

"میں سب سمجھتی ہوں سکھی چند۔" وہ بولی۔ اور سکھی چند نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا۔ "یہ اُس پار وہ ٹیکرا ہے نیرجا، جہاں کھڑے رہ کر [illegible] نے اپنے سورماؤں کو آگے جانے سے انکار کرتے ہوئے سنا تھا۔"

"میں کچھ نہیں جانتی، سکھی چند!"

"روایت یہی کہتی ہے۔"

"تم روایت کا اعتبار کر سکتے ہو، سکھی چند!"

سکھی چند نے کئی بار اس روایت پر شک کیا تھا" روایت وہ برف ہے جو ایک بار جم کر پگھلنا جانتی ہی نہیں" نیرجا کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا" ہاں میں سمجھ سکتا ہوں نیرجا، کہ سکندر اور اسکے سورما گھڑ سوار ان گاؤں تک آپہنچے تھے"

"اور کچھ یونانی سورما یہیں بس گئے ہوں گے"

"تم ٹھیک کہتی ہو نیرجا، کچھ یونانی سورما یہیں بس گئے ہونگے۔ یہیں اُن کے بیاہ ہوئے ---- ہاں میں دیکھ سکتا ہوں ان لوگوں کے چہروں پر یونانی اور پنجابی خدوخال کا امتزاج پیشِ نظر ہے۔ ان کی رگوں میں اب تک یونانی اور پنجابی خون ساتھ ساتھ بہہ رہا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا تمدن بھی دوغلا ہے"

نیرجا نے ناک سکوڑی، لفظ دوغلا سے اُسے دلی نفرت تھی، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ انتہائی ضرورت آپڑنے پر اس کا استعمال ممنوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سکھی چند نے معافی طلب نگاہوں سے نیرجا کے چہرے کا جائزہ لیا، جہاں پنجابی اور بنگالی خدوخال ملے جلے نظر آتے تھے۔ اُسے خیال آیا کہ کپور صاحب بھی ایک یونانی سورما کی طرح بنگال کے دور دراز گاؤں میں جا پہنچے تھے، جاتے ہی انہوں نے اپنا نغمہ چھیڑ دیا ہو گا۔ وہیں اُنہیں گھنگھریالے بالوں والی دلہن مل گئی جس نے نیرجا کو جنم دیا۔ نیرجا کی ستواں ناک کپور صاحب کی مرہونِ منت ہے لیکن اُس کے گھنگھریالے بال اور پیشانی اور ٹھوڑی کی ساخت ہو بہو بنگالی فن کا نمونہ ہے اور اُس کے مدبھرے نین کہہ رہے ہیں ---

اسی جگہ بنگال اور پنجاب کی سرحدیں ملتی ہیں۔

نیرجا چلّائی۔ "یہ لوگ تو ستلج میں بہہ ہی جائیں گے۔ اور ان کی عقل تو کبھی کی بہہ چکی ہے کیونکہ انہیں بے بنیاد وشواش ہے اپنے پیر پر ——— ہم بھی کیوں بہہ جائیں؟ اب تو وہ پیر آنے سے رہا۔"

سکھی چند نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراتی کیوں ہو نیرجا، ہمارے سورماؤں سے تمہیں واسطہ نہیں پڑا۔"

"تمہارے سُورما ——— ہاں تمہارے سُورما۔" نیرجا نے طنزاً کہا۔ "جو سکندر کے حملے کو نہ روک سکے تھے۔"

سکھی چند کے جی میں تو آئی کہ اس کا کھرا کھرا جواب سُنا ڈالے کہ جب بنگال کا دُور دراز گاؤں اکیلے کپُور کو نہ روک سکا اور سب کے دیکھتے دیکھتے کپُور نے ایک بنگالی چھوکری کو دلہن بنا لیا تو ہمارا گاؤں اتنے یونانی سورماؤں کو کیسے روک سکتا تھا۔ جب ڈھاکے بنگالے کا جادو کام نہ آیا تو ہمارے ٹونے ٹوٹکے بھلا کیا کر سکتے تھے۔ اُسے خیال آیا کہ سکندر کے حملے کا چھوٹا موٹا جواب تو اس گاؤں کے سُورماؤں نے ضرور دیا ہوگا اور حتی الوسع انہوں نے اسے روکنے کی کوشش بھی کی ہوگی۔ لیکن سُورماؤں کا طوفان کس کے روکے رُکا ہے؟ اس کی لہریں گاؤں کے گھروں میں گھس آئیں بہت سی کنیائیں یونانی سورماؤں کی دلہنیں بنیں۔ اُنہوں نے خوبصورت بچّوں کو جنم دیا اور اُن کی لوریوں میں یونانی گھڑ سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپ بھی کھلی ہوئی تھی۔

نیرجا پھر چلّائی۔ "سکھی چند ان جنونی لوگوں کو ہم نہ سمجھا سکیں گے۔"

"ہاں نیرجا۔" سکھی چند کہہ رہا تھا۔ "لیکن اِن سُورماؤں میں بڑے بڑے تیراک بھی ہیں نیرجا، اور یہ ہر طوفان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہاں کی لڑکیاں بھی تیرنا جانتی ہیں۔ تم ستلج کو خشمناک حالت میں دیکھ رہی ہو۔ ورنہ تم نے اسے بیحد پسند کیا ہوتا۔ یہاں کی لڑکیاں تیرتے تیرتے اُس پار جا پہنچتی ہیں۔ اُس وقت اُن کے ایک ہاتھ میں سرسوں کے ساگ کے چھنّے پر رکھی ہوئی مکئی کی روٹیاں کھدر کے پرنے میں لپٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ کیا مجال کہ تیرنے کے دوران پانی کا چھینٹا اِن روٹیوں پہ آ گرے۔ تم یہاں رہو تو تم بھی تیرنا سیکھ جاؤ۔ جب ستلج مہربان ہوتا ہے تو بیحد مہربان ہوتا ہے۔ مجھے اس کی خشمناکی دیکھ کر اس کی مہربانیاں نہیں بھول سکتیں۔ اچھے دنوں میں تم ستلج کے کنارے آ بیٹھو تو اس کی لہریں تمہارے ساتھ باتیں کریں گی، وہ تمہیں تیرنے کی دعوت دیں گی۔"

"دیکھو پیر ابھی تک نہیں آیا سکھی چند! یہ سورما تیراک دیوار بنا کر کھڑے ہو جائیں اور بڑھتے ہوئے طوفان کو آگے بڑھنے سے روک لیں۔ یہ بات میری سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن اس میں پیر کیا کرے گا؟"

ایک لمبی بارش کے بعد سورج برابر چمک رہا تھا جیسے سُورج کی کرنیں بھی کہہ رہی ہوں، ابھی بادل پھر گھر آئیں گے اور پھر ہو گی وہی موسلا دھار بارش جو کسی کے تھامے نہ تھمے گی۔ "اور اس میں پیر کیا کرے گا؟"۔۔۔۔ سکھی چند نے بات کا رُخ ستلج کی مہربانیوں کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے نیرجا کہ ستلج کو پھر سے یاد آ جائے کہ ہم اُسی کی سنتان ہیں۔"

ریپیر ابھی تک نہیں پہنچا تھا اور پانی کا زور پہلے سے بہت بڑھ گیا تھا۔ بڑے بوڑھے برابر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے کھڑے تھے۔ "یا خواجہ خضر!" ہجوم میں سے ایک بوڑھی لڑکھڑاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اور پھر سینکڑوں آوازیں مل کر دعا مانگنے لگیں "یا خواجہ خضر!" سب لوگ مل کر کھلے پانیوں کے تنہا رہنما خواجہ خضر کو پکار رہے تھے اور یہ ناممکن تھا کہ خواجہ خضر اتنے لوگوں کی اجتماعی دعا کو ٹھکرا دیتا۔

سکھی چند نے نیرجا سے کہا "ریپیر اب آئے نہ آئے، ریپیر کا کام اب لوگ خود کریں گے انہیں اپنی طاقت پر بھروسہ ہے۔ خواجہ خضر کے انصاف پر اعتماد ہے۔"

اُدھر سے بابا نیرجا کے قریب آ کر بولا "طوفان اب تھما کہ تھما۔ اب مت گھبرانا۔"

اور بہرے بابا کے کان کے قریب منہ لیجا کر نیرجا نے بلند آواز سے کہا "ہاں بابا!"

بابا نے للچاتی ہوئی نگاہوں سے نیرجا کی طرف دیکھا۔ سکھی چند کو یوں محسوس ہوا جیسے بابا کی دور دراز جوانی اُس کے نزدیک آ گئی ہو اور جیسے دور دراز ماضی بھی زمانۂ حال میں تبدیل ہو گیا ہو اور جیسے سکندر کا حملہ خاص اسی صدی کا واقعہ ہو وہ خیالات کی لہروں میں کھو گیا۔ . . . تنہائی اور سکوت کا عالم تھا اور کوئی ایک نوجوان دھیمے سُروں میں کہہ رہا تھا۔ ہاں تو تمہاری ماں سچ کہتی تھی۔ کیا کہتی تھی وہ؟ یہی نا کہ بیٹی، تیرا دولھا گھوڑے پر سوار ہو کر آئے گا۔ میں آ گیا۔ مجھے دیکھ لو۔ مجھے پسند کر لو۔ میری دلہن بنو گی تمہیں گھاٹا نہیں رہے گا ——— اور پھر خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک چھوکری کی آواز آئی ——— ہاں میرے راجہ، میں تمہاری دلہن ہوں۔ یہیں رہنا۔ بھاگ مت جانا۔ یہ نہ ہو کہ لوریاں

دیتے ہوئے ہیں اپنے بچے کے روبرو عمر بھر اُس کے پردیسی باپ کی شکایت کرتی رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

سکھی چند کو محسوس ہوا کہ یہ آخری آواز اُس کی اپنی ماں کی آواز تھی۔ اُسے وہ پھبتی یاد آئی جو تیرتھ ہمیشہ اُس پر کسا کرتا ___ "سکندر کا بیٹا" اُس وقت آئینہ سامنے ہوتا تو یقیناً اُسے اپنے خد و خال پر یونانی اثر غالب نظر آتا۔ تیرتھ کی پھبتی اُسے بہت بڑی حقیقت معلوم ہونے لگی۔ لاکھ کوئی کہے سکندر کا قصہ بہت پہلے کا ہے۔ اگر آج بھی کپور صاحب ڈھاکے بنگالے کی دلہن حاصل کر سکتے ہیں تو بھلا سکندر رہی ستلج پار کے گاؤں میں کیوں بیاہ نہیں رچا سکتا۔ تیرتھ سچ کہتا تھا ___ سکندر کا بیٹا، سکندر کا بیٹا طوفانی لہروں کے اُس پار وہ ٹیکرا تھا جہاں کھڑے ہو کر سکندر نے اپنے سُورما گھڑسواروں کو دنیا پر فتح پانے کے آدرش کی تکمیل کے لئے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانے کی ترغیب دی تھی۔ لیکن اس گاؤں میں آکر وہ خود ہار گیا ___ ایک لڑکی کے روبرو۔ اور آج سکندر کا بیٹا بھی تو اپنی ہار مان رہا تھا ___ نیرجا کے روبرو۔ جس نے ابھی تک اُسے قبول نہیں کیا تھا۔ اُس کے خیالات نیرجا کو ہمیشہ دوغلے معلوم ہوتے اور یہ سکندر کا بیٹا جھنجھلا کہ کہہ اُٹھتا ہماری انسانیت، ہمارا تمدن، ہمارا فن، آج کچھ بھی تو دوغلا پن سے مبرا نہیں، نیرجا!

پیر آ پہنچا، اور ہجوم کا شور بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ بوڑھے پیر پر لوگوں کی اُمیدیں مرکوز ہو گئیں۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ پیر کس طرح دعا مانگے گا اور کون کون سے نئے

اور پرانے ٹونے استعمال کریگا۔ اُنہیں بس ایک ہی خیال تھا کہ طوفان اب اور نہیں بڑھ سکتا اور سب کے دیکھتے دیکھتے پانی پیچھے ہٹ جائیگا۔ بابا اپنی بوڑھی آواز سے چلایا۔ "سب پرے ہٹ جاؤ۔ پیر کو دعا مانگنے دو۔ پچاس سال سے تو میں اسے پیر کے حکم میں بندھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔"

"پیر کو ستلج کا منتر یاد ہے۔" ایک بڑھیا براہمنی کہہ رہی تھی۔ "دھنیہ ہو ستلج دیوتا تمہاری شکتی اپرم پار ہے۔"

روتے ہوئے بچے چپ ہو گئے۔ بڑوں بوڑھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب اُنہیں پتھر کے بتوں کی طرح دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے کھڑے رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ دوشیزائیں اور نوجوان پیر کا جادو دیکھنے کے لئے منتظر تھے۔

پیر خاموش تھا۔ ابھی تک اُس کے ہونٹ نہ ہلے تھے۔ شاید وہ اپنی تمام طاقت ایک نقطے پر جمع کر رہا تھا۔ یہ اُس کا امتحان تھا — اُس کی دعاؤں کا امتحان۔ یا شاید وہ کوئی بھولا ہوا داؤ یاد کر رہا تھا۔ اُسے سچے سائیں پر اعتقاد تھا۔

پہلے بڑے بوڑھوں نے پیر کے پاؤں چُومے۔ پھر ادھیڑ عمر کے لوگوں نے، پھر جوانوں نے — اور اب دوشیزائیں باری باری پیر کے پاؤں چوم رہی تھیں۔

نیرجا کو یوں ہجوم سے ہٹ کر تماشہ دیکھنا ناگوار گذر رہا تھا۔ سکھی چند کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "چلو چل کر پیر کو منتر پڑھتے دیکھیں، سکھی چند، ذرا چلنے سے پیروں میں خون بھی حرکت کرنے لگے گا۔"

یونہی وہ ہجوم کے قریب پہنچے انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پانی بدستور بڑھا چلا آتا ہے۔ بڑے اطمینان سے وہ پیر کے جادو کا انتظار کرنے لگے۔ ہجوم کے شور سے کچھ آوازیں اُبھرتی دکھائی دیں، کچھ مردانہ، کچھ زنانہ ——

”رات بھر میں بشنے کا کھیت کٹ گیا۔“

”طوفان ہٹ بھی جائے تو وہاں اب ریت ہی ریت ہوگی۔“

”اب پیر کا ٹونا ریت کو کیسے دور کر سکتا ہے؟“

”اِتنا تھوڑا ہے کہ پیر ڈوبتے گاؤں کو بچا لے۔“

”پیر تو گاؤں بھر کا باپ ہے۔“

”ہاں بہن، ستلج پیر کی بات نہیں ٹال سکتا۔“

”پیر ناراض بھی ہو گا تو ہمیشہ کے لئے ناتا توڑنے سے رہا۔“

”پیر کا صدقہ میری بار ایک بار مینڈھیوں کو رب خیر کرے ستلج پیچھے ہٹ جائے۔“

”دودھ پُوت پہ پیر کی مہر۔“

”پیر ریت کو چھو دے تو سونا ہو جائے، پانی کو چھو دے تو دودھ ہو جائے۔“

لیکن پیر خاموش تھا۔ بابا بھی اُس کے قریب کھڑا تھا۔ نیر جا کو اپنے قریب پا کر بابا نے پھر بوڑھی آواز کا مظاہرہ کیا۔ ”پچاس سال سے تو میں اِسے پیر کے حکم میں بندھا ہوا دیکھ ہی رہا ہوں۔“

سکھی چند کو بابا کی آواز پر جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔ نیرجا کے کان کے قریب منہ لیجا کر اُس نے پوچھا۔ "کیوں نیرجا، یہاں اچھا لگتا ہے یا پھر ہجوم سے ہٹ کر کھڑے ہونا پسند کروگی؟ مجھے تو یہاں متلی ہو رہی ہے اور اس شور میں میرے کان الگ پھٹے جا رہے ہیں۔"

"خواجہ خضر کے پاؤں کسی کنیا نے چومے ہوں یا نہیں۔" نیرجا کہہ رہی تھی "لیکن پیر کے پاؤں تو یہ سب کنیائیں چوم رہی ہیں، بابا کو دیکھو، وہ بھی شاید پیر کے ساتھ منتر پڑھے گا۔"

"بابا کی کیا بات ہے نیرجا! اَن گنت صدیوں سے وہ پیر کے ہمراہ منتر پڑھتا آیا ہے۔ لیکن اُس وقت کہاں تھا اُس کا منتر جب سکندر نے حملہ کیا تھا؟ تب پیر کی بھی پیش نہ چلی۔"

نیرجا بولی۔ "پیر کے پاؤں چومنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ سکھی چند —— سکندر سے بھی پُرانی۔ خواجہ خضر پُرانے وقتوں کا جل دیوتا معلوم ہوتا ہے۔"

"ماضی کی منجمد رسم پر مجھے بُری طرح غصہ آ رہا ہے۔" سکھی چند نے شہ دی لاکھ کوئی کہے کہ جل دیوتا کی پوجا وحشی پن سے مبرا ہے۔ میرا دماغ اِن جنونی لوگوں کی طرح کبھی اسے قبول نہیں کر سکتا۔"

نیرجا کی اُنگلیاں بار بار جوڑے کی طرف اُٹھ جاتیں پنجابی نائن ایسا جوڑا نہ گوندھ سکتی تھی، یہ تو بنگالی ہاتھوں کا کام تھا۔ یہ جوڑا ہی سکھی چند کو اُس کے قریب

لایا تھا اور سکھی چند کا یہ خیال کہ پنجابی دوشیزہ کے سر پہ باریک بیند ھیوں کا باریک جال یونانی آنکھوں کو بھی پسند آیا ہوگا، اُسے بہرے سے بے سر پیر کی گپ نظر آنے لگا۔

قریب ہی ایک دوشیزہ بیر جا کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ حیران ہو کہ یہ عجیب و غریب جوڑے والی لڑکی پیر کے پاؤں کیوں نہیں چومتی اور دعا کیوں نہیں مانگتی۔ پیر کا صدقہ بہرے جوڑے کو، رب خیر کرے، ستلج پیچھے ہٹ جائے۔

پانی کی سطح نیچی تھی۔ طوفانی لہریں پہلے کنارے کی بنیادیں کھوکھلی کر دیتیں پھر جب بڑا سا تودہ گر جاتا تو ان کا حملہ شروع ہو جاتا۔

لوگوں کو برابر اپنے بوڑھے پیر پہ اعتقاد تھا۔ بچے بوڑھے جوان سب شور مچا رہے تھے۔ جیسے یہ شور بھی پیر کے ٹونے کا جز ہو لیکن پیر آگے بڑھنے سے جھجکتا تھا شاید اُسے اپنی طاقت پہ یقین نہیں رہا تھا۔ جب سے وہ آیا تھا کنارے سے کئی تودے گر کر پانی میں ڈوب گئے تھے۔

بڑے بوڑھوں نے ایک بار پھر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا لئے۔ بچوں نے پھر سے ہلڑ مچانا شروع کر دیا۔ ادھیڑ عمر کے لوگ بچوں کو چپ کرانے کے بہانے خود بھی اس ہلڑ میں حصّہ لے رہے تھے۔

سب سے زیادہ خطرہ بنیوں کو محسوس ہو رہا تھا۔ اور بابا انہیں سمجھا رہا تھا "اب گاؤں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بس نہ گھبرائیے جاؤ۔ ستلج بیچارے کی کیا مجال کہ پیر کی حکم عدولی کرے پچاس سال سے تو میں اُسے پیر کے حکم میں بندھا ہوا دیکھ ہی رہا ہوں۔"

پیر اب دعا مانگ رہا تھا۔ وہی ستلج تھا، وہی پیر۔ بابا حیران تھا آج ہو کیا گیا؟ آج صبح کس کا منہ دیکھا ہوگا پیر نے آنکھ کھلنے پر، کلجگ ہے کلجگ۔ انصاف چلا گیا۔ جھوٹ نے پاؤں پھیلا لیئے۔ پیر کی دعا میں بھی طاقت نہیں رہی۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی تودے گر گئے اور اب اُن سے گستاخ لہریں ٹکرا رہی تھیں۔ پیر بھی حیران تھا۔ لیکن وہ بدستور دعا پڑھ رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ستلج کو ہٹنا پڑے گا آہستہ آہستہ وہ کنارے کے قریب سرک رہا تھا۔

سکھی چند نے نیرجا کو جھنجھوڑتے ہوتے کہا "نیرجا۔ نیرجا! طوفان تو آتے ہی رہیں گے۔ اُن پر کسی پیر کا حکم نہیں چل سکتا ——— دریاؤں کے طوفان ——— تہذیب و تمدن کے طوفان ——— ستلج کو تو تم نے دیکھ ہی لیا۔ اب اور کیا چاہیئے؟ ——— چلو اب یہاں سے چلیں۔"

اِدھر ہجوم کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا کیونکہ ایک اور تودہ پانی کی نذر ہو گیا اور اُس کے ساتھ ہی بپھرے ہوئے ستلج کی بپھری ہوئی لہریں بوڑھے پیر کو اُس ہجوم، اُس گاؤں، اُس شور و شغب سے دور بہائے لیئے جا رہی تھیں۔

پُل

دلہن کی سسکیاں بے اختیار چیخوں میں بدل گئیں تو ڈھولوں کی ڈڑ وگہ ڈگڑ بھی جھٹ دھم دھم دھما دھم دھم کی اُٹھان تک جا پہنچی۔ اور شہنائیوں کا تھرّاتا ہوا نغمہ آخری پرواز کا جوہر دکھانے لگا۔ "گلیاں تاں ہوئیاں بابل بھیڑیاں۔۔۔۔" عورتیں دلہن کی طرف سے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گیت گا رہی تھیں۔ وہ گیت جو گاؤں کی فضا میں نئی لہریں پیدا کر دیتے تھے۔ بابل، میرے لئے میکے کی گلیاں تنگ ہو گئیں۔ آنگن پردیس ہو گیا، سن تو سہی میرے باپ، ہر کسی کے من میں چاؤ ہے، پر میرا دل تو آنسوؤں کا دریا بنا جا رہا ہے۔

ڈولی اُٹھنے کا وقت قریب تھا۔ یہ ڈھول، یہ شہنائیاں اور ڈولی کے گیت تو ضروری تھے۔ ان کے بغیر ڈولی کیسے اٹھ سکتی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا دلہن کی منّت سماجت

بیکار ہے۔ یہ سچ تھا کہ اُس نے کبھی ماں کی شان میں گستاخی نہ برتی تھی۔ لیکن اب اس دلیل سے وہ ماں کو ڈولی رو کنے پر رضامند کرا لے، یہ ناممکن تھا۔

اندھی ناجو ڈولی کے اندر سر ڈالے کھڑی تھی۔ ماں نے اُس کا کندھا جھٹکتے ہوئے کہا۔" ادھر آجا ناجو، اب ڈولی چلے گی۔" لیکن وہ برابر دلہن کی مینڈھیوں کو سہلاتی رہی

سہاگ پٹاری اٹھائے نائن سوچ رہی تھی کہ سات کوس کا سفر اب پیدل ہی طے کرنا ہوگا۔ بیل گاڑی کا انتظام ہو جاتا تو میں دلہن کے ساتھ بیٹھ جاتی۔ دلہن کی چیخوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لوگ چاہتے ہیں کہ دلہن روئے۔ اور دلہن رو رہی ہے۔ گاؤں سے نکلتے ہی اس کے آنسو تھم جائیں گے۔ سسرال پہنچ کر وہ میکے کو بھول جائے گی۔ ہر لڑکی یونہی کرتی ہے۔ پہلے روتی ہے۔ پھر ہنستی ہے۔ جی چاہتا ہے سہاگ پٹاری رکھ کر پرے ہٹ جاؤں اور ڈولی کے ہمراہ پیدل چلنے سے انکار کر دوں۔

دلہن چاہتی تھی ابھی ڈولی نہ اُٹھے۔ اور ناجو بہن تھوڑا اور گلے مل لے۔ بلکہ وہ تو چاہتی تھی کہ برات والے اسکی بجائے ناجو کو لے جائیں۔ ناجو مہندی کے عطر کا پھوہا لیتی آئی تھی۔ اور بڑے چاؤ سے اُس نے اُس کی مینڈھیوں پر مل دیا تھا۔ تاکہ راستہ بھر خوشبو آتی رہے۔

دلہن کی ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور آوازمیں رقّت۔ ڈولی کے گیت تو سہاگ کے منتر تھے۔ اسے بدھائی پہ بدھائی مل رہی تھی۔ ایک بار پھر اُس نے ناجو کا کندھا جھٹک کر کہا۔" بہت ہو لیا ملاپ ناجو!" اور پھر وہ گانے والیوں سے ہمنوا ہو کر

ڈولی کا گیت گانے لگی۔

ناجو کہہ رہی تھی "اب چاند ستاروں کی باتیں کسے سناؤں گی۔ میں تو ہمیشہ تجھے اپنی آنکھیں سمجھتی رہی۔ آج میں اندھی ہو گئی۔"

اشارہ پاتے ہی کہار آگے بڑھے۔ ماں نے ناجو کا بازو تھام لیا اور کہا۔ "ناجو! تجھے کوئی نہیں چھین سکتا تو میرے پاس رہے گی۔" اور پھر یونہی اس نے دُلہن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آشیرباد دیا، کہاروں نے ڈولی اُٹھائی۔

تھوڑی دور تک عورتیں اور لڑکیاں ڈولی کے پیچھے پیچھے گئیں۔ لیکن ڈولی کے ہمراہ صرف نائن ہی گئی۔ اب تو ڈھول لئے اور شہنائیوں والے بھی گاؤں کو لوٹ گئے تھے۔

ڈولی جا رہی تھی۔ آگے آگے دولہا اور اُس کے یار دوست پیچھے پیچھے نائن اور اس کے پیچھے بیس پچیس براتی اور دولھا کا باپ سب پیدل چل رہے تھے۔

دُلہن ڈولی کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور ہچکولے لینے لگی۔ ابھی تک گیتوں کی راتوں کا خمار اُس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ ڈھولوں کی دھم دھم دھما دھم دھم ابھی تک اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔ اور شہنائیوں کی پکار بھی جیسے اس کے ذہن پر برابر دستک دے رہی ہو۔ ڈھول اور شہنائیاں نہ بجیں تو بہت سی لڑکیاں بیاہ کرانے سے انکار کر دیں۔ یہ سوچ کر اس نے ڈھولوں اور شہنائیوں کی آواز کو ذہن سے نکالنے کی کوشش شروع کر دی۔

دس بارہ راتوں کی بے خوابی اور اب ہچکولے پہ ہچکولا۔ سیدھے ہو کر تو یہ لوگ

چل ہی نہیں سکتے۔ اُمس کے مارے وہ بہت پریشان تھی۔ اُسے متلی سی ہونے لگی۔ بڑی بہن کنواری رہ جائے اور چھوٹی بہن کا بیاہ ہو جائے یہ تو گھور انیائے ہے۔ وہ چاہتی تھی ڈولی سے کُود پڑے۔ اُس کا بس چلتا تو ان لوگوں کی قید سے آزاد ہو جاتی۔ اُسے مہندی کے عطر پر بھی بُری طرح غصّہ آ رہا تھا۔ مجھے نہیں چاہیئے یہ خوشبو۔ ناجو سچ کہہ رہی تھی آج وہ اندھی ہو گئی۔ وہ مجھے اپنی آنکھیں سمجھتی رہی۔ اب وہ کیسے دیکھے گی؟ وہ چاہتی تھی کہ زور زور سے چلّائے۔ اور نائن سے کہے کہ وہ اُسے واپس لے جائے کسی طرح برات والے اُسے چھوڑ سکتے تو وہ ہمیشہ کے لئے کنواری رہنا منظور کر لیتی وہ چاہتی تھی نتھ اُتار پھینکے۔ اس بلاق کی کیا ضرورت ہے؟ نہ ماتھے کا جھُومر، نہ کانوں کی بالیاں، نہ گلے کا چندن ہار، اُسے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اُسے اپنے سِنگار سے نفرت تھی۔ لال شلوار قمیص اور سر پر لال سالو، یہ کیسا بھیس ہے؟

کاش انہی شہنائیوں کے ساتھ ناجو کا بھی بیاہ ہو جاتا۔ برات میں اتنے لڑکے آئے تھے کیا کسی کو ناجو سے بیاہ کرنا منظور نہ تھا؟ ناجو کو شہنائیاں پسند ہیں۔ اب اُس کے لئے کون شہنائیاں بجائے گا؟ جانے اس کا بیاہ کبھی ہو گا بھی یا نہیں۔ اس کا دولہا کہاں سے آئیگا؟ وہ چاند ستاروں کی باتیں لے بیٹھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ چاند ستاروں کو دیکھ سکتی ہے۔ اب چاند ستاروں کی باتیں اس سے کون سُنے گا؟

تین کہار نوجوان تھے اور ایک بہت بوڑھا۔ نوجوان کہار تیز تیز قدم اٹھانے لگتے تو بوڑھے کے لئے مشکل پیدا ہو جاتی۔ راستہ ریتیلا تھا۔ ہر کسی کے پاؤں ریت میں دھنس جاتے

تھے۔ برات کچھ پیچھے رہ گئی تھی۔ اور دولھا اپنے یار دوستوں کے ساتھ ذرا آگے نکل گیا تھا۔

"بڑے کٹھن دن ہیں" ــــ بوڑھا کہار بولا۔ "یہ مہنگائی کاٹے نہیں کٹتی"۔

"سستائی ہو چاہے مہنگائی" ــــ نوجوان کہار نے شہ دی۔ "لڑکی والے لڑکی کو گھر میں کب تک بٹھا سکتے ہیں"۔

"ہماری کوئی نہیں سنتا" ــــ دوسرا کہار بولا۔ "یہ امیر تو پھر بھی گذر کر لیتے ہیں۔

"پنچایت نے ہمارا دلاگ، نہیں بڑھایا" ــــ تیسرا نوجوان کہہ اٹھا۔ "اتنے پیسوں پہ اب کون ڈولی اٹھائے"۔

"یہی حالت رہی تو ڈولی کہیں نظر نہیں آئے گی" ــــ بوڑھا کہار پیشین گوئی کے انداز میں بولا۔ "بس اب ڈولی چند ہی دنوں کی مہمان ہے"۔

دُلہن کو یوں محسوس ہوا کہ کہار ڈولی رکھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ اتنا اُمس۔ باپ رے۔ چلو اسی بہانے پیپل یا بڑ کے نیچے دم لینے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن کہار بدستور چلتے رہے۔ ان لوگوں کا دلاگ ہمیشہ یہی رہے گا۔ دُلہن سوچ رہی تھی۔ اپنے حق کے لئے لڑنے جھگڑنے کی ہمّت اِن میں کہاں۔

ناجو کے لئے سب شہنائیوں والے مر گئے۔ تو کیا ناجو عمر بھر کنواری رہے گی؟ ہے بھگوان یہ کیا تیرا انیائے ہے؟ تو تم نے جنم ہی سے اس کی آنکھیں کیوں چھین لیں؟ آواز ایسی کہ اس کے سامنے پائل کی چھنن چھنن بھی مات ہو جائے۔ ناچ میں وہ آنکھوں والیوں سے بازی لے جاتی ہے۔ خوب بن ٹھن کر گھونگٹ کاڑھے بیٹھ جائے تو شاید کوئی شہزادہ

بھی اُسے اپنی دلہن بنالے۔ تو کیا اب اس کا بیاہ نہ ہوگا؟ اُس کے بال ایڑیوں کو چھوتے ہیں۔ ناچتی ہے تو ایسے کہ کوئی گُونج پر تول رہی ہو۔ کاش میری آنکھیں سچ مچ اُس کے چہرے پر لگ جائیں۔ پھر میں دیکھتی کہ اس کے لئے کون کون ترستا ہے۔ لیکن میں کیسے دیکھتی؟ میری آنکھیں تو ناجو کے چہرے پہ لگ جائیں۔

اسے یاد تھا کہ ایک بار ناجو نے کہا تھا، میں کب اندھی ہوں۔ عمر بھر مجھ سے چاند ستاروں کی باتیں سُنتی رہو۔ میری باتیں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں۔

پُورب کی ایک لڑکی کے قہقہے اس کے ذہن میں جھانجھ کی طرح گونج اُٹھے۔ ناجو اس کے ساتھ ہمنوا ہو کر گا اٹھتی۔ اور وہ ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ ساری ناجو! تو پچھلے جنم کی بہن ہے۔ دونوں مل کر ناچنے لگتیں اور گاتیں۔

پنجاب دیس ری ننددی
بڑی دور دور دور
پنجاب دیس کے چھوہرے
برسے نُور نُور نُور!

اُسے خوشی تھی کہ دولھا کی آنکھوں سے نور برستا ہے۔ لیکن جیسے چھننگ آتے آتے پلٹ جائے اس کی طبیعت پھر پریشان ہو گئی۔ جیسے اس نے ناجو سے اس کا دولھا چھین لیا ہو۔ اب تو تیز ہوا چل پڑی تھی۔ ڈولی کا پردہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ ڈولی آگے ہی آگے چلی جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا نائن سے بات کرے لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی یہ تو نائن کا فرض ہے کہ

مجھ سے پوچھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ آخر وہ میرے ہمراہ کیوں آئی ہے؟ پیدل چلنا پڑ گیا تو جل بھُن کر رہ گئی۔ لے دے کے کل سات کوس کا تو سفر ہے۔ دو اور تین پانچ اور دو سات کوس کا سفر۔ اب اگر میں اُسے آواز بھی دوں تو وہ سُنی ان سنی کر دے گی۔ وہ ایک پہیلی ہے جسے میں نہیں بُوجھ سکتی۔ کیا اب وہ راستے بھر مجھ سے بات نہیں کرے گی؟

اُس نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ارے ارے میرا چہرہ تو لال ہو رہا ہے۔ اور میری شربتی آنکھیں شرمسار نظر آتی ہیں جیسے انہوں نے کوئی جرم کیا ہو۔

ہوا برابر ڈولی کے پردے سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ اُس نے سوچا اب آسمان پر بادل گھر آئیں تو مزہ آجائے۔ جب وہ بچپن میں ماں سے کھُرچن مانگتی ہمیشہ یہی جواب ملتا کہ بیاہ پر موسلا دھار مینہ برسے گا۔ لیکن اُسے تو اِس کی کچھ پرواہی نہ تھی۔ حیرت سے وہ آسمان کی طرف دیکھتی رہی۔ جہاں بادلوں کا کچھ پتہ نہ چل سکتا تھا۔ آجکل موسلا دھار مینہ تو برس ہی نہیں سکتا۔ بوندا باندی ہو جائے وہی غنیمت ہے۔ جس کی بابت کہا کرتے ہیں کہ بھینس کا ایک سینگ بھیگا ہوا اور ایک سرے سے خشک۔ وہ ٹکٹکی باندھے افق کی طرف دیکھتی رہی۔

"کہار سونے میں ڈھلا ہوا بھی کیوں نہ ہو" ——— بوڑھا کہار بولا۔ "اُس کے کندھے ضرور پیتل کے ہونے چاہئیں۔"

"بڑھاپے میں تو پیتل بھی سونا بن جاتا ہے" ——— ایک نوجوان کہار نے پھبتی کسی۔ "اب یہ کام چھوڑ دو۔ تم بوجھ نہیں ڈھو سکتے۔"

"بابا کو یونہی ساتھ لے لیا"۔۔۔ دوسرا بولا۔"ڈولی کا بوجھ تو ہم تینوں کے کندھے پر ہے"

"ہاں ہاں"۔۔۔ تیسرا کہار کہہ اُٹھا۔"ہم اپنے 'لاگ' میں سے بابا کو برابر کا حِصّہ کیسے دے سکتے ہیں؟"

"تم مجھے کچھ بھی نہ دینا"۔۔۔ بابا بولا۔"بس مجھے ڈولی اُٹھانے سے روکو مت"

"روکتا کون ہے بابا"۔۔۔ پہلا جوان کہہ اُٹھا۔"تیز تیز قدم اٹھاؤ"

"کیوں ڈولی اٹھانے میں کچھ مزا آتا ہے بابا"۔۔۔ دوسرے نوجوان نے لقمہ دیا۔"ڈولیاں اٹھاتے اٹھاتے من نہیں بھرا؟"

"یہ سب پیٹ کا دھندا ہے"۔۔۔ تیسرے نوجوان نے حاشیہ چڑھایا۔"روٹی سو سو غُلامیاں کراتی ہے"

"روٹی بھی ضروری ہے"۔۔۔ بابا بولا۔"پر خالی خولی روٹی کے لئے میں ڈولی نہیں اُٹھاتا اپنے کام کا مزہ بھی تو ہوتا ہے"

دُلہن خوش تھی کہ بابا کو اُس کی ڈولی اٹھاتے ہوئے مزہ آرہا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ بابا افیمی ہے اور اب معلوم ہوا کہ افیم ہی کی طرح اُسے ڈولی اُٹھانے کا بھی نشہ ہے۔ سب پیٹ کا دھندا ہے یہ سچ کہتے ہیں۔ روٹی سَو سَو غلامیاں کراتی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہونگے کہ میں شہزادی ہوں ۔۔۔۔ ڈولی کی دلہن۔ پر میں بھی غلام ہوں۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے، انہیں بھی مجھ سے ہمدردی ہونی چاہیئے۔

کیا بیاہ ضروری ہے؟ ڈولی میں بیٹھ کر سُسرال پہنچنے کے بغیر کیا بیاہ نہیں ہوسکتا؟

اُس وقت اُس کے ذہن میں وہ گیت گونج اُٹھا جس میں ایک لڑکی کہتی ہے ـــــ مَیں نے تجھ سے کہا تو تھا بابل کہ میرا بیاہ بیاہ اسوج میں کیجیو تاکہ کوٹھڑی میں پڑے پڑے پکوانوں سے سڑاہند نہ اٹھنے لگے۔ اور دہی بھی کھٹاس نہ پکڑ سکے...... ارے ارے میرے سپنے تو بلبلے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں پانی میں صابن گھول کر گیہوں کی تیلی سے پھونک مار مار کر بلبلے اُڑایا کرتی تھی۔ ان بلبلوں کے رنگ سورج کی روشنی میں کتنے بھلے لگتے لیکن بلبلوں کی عمر ہی کیا.... بیاہ کی اتنی فکر؟..... ہاں میری بنّو تیرا بیاہ اسوج ہی میں کریں گے۔ پکوانوں سے سڑاہند نہیں اُٹھے گی۔ دہی کھٹاس نہیں پکڑ سکے گا.....

وہ لڑکی سچ کہتی تھی جس نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ مجھے کنواری ہی رکھ لو۔ تم گیہوں کے کھیتوں میں آبیاری کیا کرو گے تو میں تمہارا ہاتھ بٹایا کرونگی۔ لیکن ہمیشہ میکے ہی میں رہنے کی شرط بھی تو فضول ہے..... میں تو عمر بھر میکے میں رہنا کبھی پسند نہ کروں۔

ایک بار پھر بڑی شدّت سے اُسے ناجو کا دھیان آیا۔ جیسے اس کی برات پکوانوں سے سڑاہند محسوس کرتے ہی اُٹھ کر چلی گئی ہو۔ دہی نے بھی تو کھٹاس پکڑ لی تھی۔ براتی یہ دہی کیسے کھا سکتے تھے؟ ناجو رد کر دی گئی۔ واہ ری ناجو اب موج کر۔ تیرے لئے میکے کی گلیاں کبھی تنگ نہیں ہو سکتیں، آنگن پردیس نہیں ہو سکتا۔ ارے ارے عمر بھر میکے میں رہنا بھی تو کٹھن ہے۔

یہ نگوڑی مہندی کے عطر کی خوشبو۔ ناجو بھی پگلی ہے۔ ناحق عطر کا پھویا لیتی آئی، اور میری ہتھیلیوں پر مل دیا۔ یہ میری لال شلوار قمیص۔ مجھے ان سے نفرت ہے۔ یہ زری کے

پھُول بوٹے۔ میرا بس چلتا تو یہ کپڑے ناجو کو پہنا دیتی۔ ہُونہہ! ناجو تو ابھاگی ہے۔ ذات کی چھُپکلی شہتیروں سے بغل گیر ہونے کا دعویٰ۔ چاند ستاروں کی باتیں۔ ہُونہہ۔ اُس نے چاند ستارے کب دیکھے ہیں؟ چاند ستارے تو اس کا منہ چڑاتے ہیں۔

ممیا ممیا کر ناجو کہتی ہے۔ سات ستاروں سے پرے ایک ستارہ ہے ہُونہہ۔ جیسے سچ مچ ستارے دیکھ رہی ہو۔ سات چھپکلیوں سے پرے ایک چھپکلی ہے جو شہتیروں سے بغل گیر ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ آخ تھو۔ جگنو تو نظر نہیں آتے ستارے دیکھنے کا دعویٰ۔

میَں دلہن ہوں میرے ہاتھ میں آئینہ ہے۔ اِس ڈولی میں مُجھ سے خوبصُورت دلہن سوار نہ ہوئی ہوگی۔ ارے ارے میں خود ہی اپنے حسن کی تعریف کر رہی ہوں۔ دُولھا نے ابھی مجھے دیکھا بھی نہیں۔ وہ پوچھے گا کے برس ہو گی تیری عمر۔ میں کہوں گی سولہ برس۔ جھوٹ تھوڑی ہے۔ سولہ برس ہی کی تو ہوں۔

جیسے کوئی لمبا خواب دیکھتے دیکھتے بے وجہ چونک پڑے۔ یہ کون تھا جو مجھے گود میں رکھ کر گھما رہا تھا؟ ابھی تک میرا بچپنا ختم نہیں ہوا۔ چلّاتے ہوئے اونٹ ہی لادے جاتے ہیں۔ میری چیخوں کی کسی نے پروا نہ کی۔ مجھے ڈولی میں سوار کرا دیا۔ اب تو یہ ڈولی مجھے منزل پر پہنچا کر ہی چھوڑے گی۔ یہ میرے جسم میں جھرجھری سی کیا دوڑ جاتی ہے!

یہ میری ٹھوڑی آج اتنی ملبوتری کیوں ہو رہی ہے۔ آئینہ تو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اور یہ گالوں میں گڑھے سے کیا ہیں؟ ارے ارے یہ تو اچھے نہیں۔ ہائے رام۔ میرا چہرہ بدل کیوں رہا ہے؟ جی چاہتا ہے آئینہ کو چوم لوں۔ آئینہ نیا ہے۔ لیکن نئے آئینے ہی کی وجہ سے تو میرا

چہرہ بدلا ہوا نظر نہیں آسکتا۔

کیا وید منتر بہت سچے ہوتے ہیں۔ یگیہ کی اگنی ہی اتنی پوتر ہوتی ہے؟

یہ میرے گالوں پر گھنی پلکیں یوں کانپنے کیوں لگتی ہیں؟ یہ سالو اتنا لال کیوں ہے؟ مجھے منتروں کی پروا نہیں۔ بھلے ہی وہ سالو کی طرح لال ہی کیوں نہ ہوں۔ بھلے ہی ان سے مہندی کے عطر کی لپٹیں کیوں نہ آرہی ہوں۔

مجھے یہ متلی سی کیا ہونے لگتی ہے؟ الائچی منہ میں ڈال کر دیکھوں۔ بس۔ بس۔ الائچی میں بھی گُن نہیں رہا۔ لونگ منہ میں ڈال کر دیکھوں۔ آخ تھو۔ لونگ بھی مجھے اچھا نہیں لگتا آج تو میں ناجو کے ہاتھ سے بھی لونگ قبول نہ کروں۔

جنداں کے بیاہ پر موٹر آئی تھی۔ میرے بیاہ پر بیل گاڑی بھی نہیں آئی۔ نائن ناراض ہے پیدل چلنا پڑ گیا۔ تو جل بھُن گئی۔ اونہہ۔ لے دیکھے تو سات کوس ہیں۔ کبھی پیدل بھی چلنا پڑ جاتا ہے۔ وہ سوچتی ہوگی جہاں بیاہ پر اتنا خرچ کیا وہاں بیل گاڑی پر کون سے سیکڑے خرچ ہو جاتے۔ پگلی یا تو سب کام نائن سے پوچھ کر کئے جائیں۔

ڈولی کے آگے آگے چلتا ہوا دولہا سوچتا ہے کہ برات اب راستہ میں آرام نہیں کر سکتی۔ وہاں دلہن کا انتظار کیا جا رہا ہوگا۔ گاؤں کی لڑکیاں گھونگھٹ اٹھا کر دیکھیں گی ارے ایسی دلہن تو پہلے اس گاؤں میں آئی نہیں۔ کوئی کہے گی دیوی ہے۔ کوئی اپسرا بتائیگی پہلے گھر کی دہلیز پر تیل ڈالا جائیگا۔ جب کہیں دلہن گھر کے اندر جائے گی۔

دلہن چاہتی تھی دولہا سے باتیں کر سکے۔ یکبارگی اُس کے ذہن میں وہ نغمہ گونج اٹھا

جو اس وقت گایا جاتا تھا جب چاندنی راتوں کا ناچ عروج پر ہوتا تھا:

"مینوں اَج دی رات نہ چھیڑیں، مہندی والے ہتھ بنھ دی !"

کسی نے اپنے مہندی رچے ہاتھوں کا واسطہ دیکر دولہا سے سہاگ رات ملتوی کرنے کی التجا کی تھی۔ دُلہن نے جھٹ مہندی رچے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ڈولی کا پردہ پچھم سے آنے والی ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ جیسے یہ دُلہن کے پوشیدہ جذبات سے آشنا ہو دلہن کو پردے کی ہر حرکت پر غصّہ آ رہا تھا۔ یہ ہمیشہ ہوا کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ جیسے یہ بھی آج وہی گیت گانا چاہتا ہو۔

آئینہ سامنے رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی اپنی مینڈھیاں کھول ڈالے اور کسی نائن کی مدد لئے بغیر خود ہی اپنے بال سنوار لے۔

جنداں سے ملاقات ہوئے کتنے مہینے ہو گئے۔ اب وہ گاؤں میں کیوں نہیں آتی؟ کوئی سہیلی بدھوا ہو گئی۔ کوئی پتی کے ہوتے ہوئے بھی بدھوا سے بُری حالت میں ہے۔ جنداں ہی سب سے خوش قسمت ہے۔ گھر گھر اُس کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں بھی اپنے پتی کو خوش رکھونگی۔ سات کوس کی منزل اتنی بھاری۔ گھر کی دہلیز پر کب رکھونگی؟ بنیاد یا کب روشن کرونگی؟ دولہا سے کب باتیں کرونگی؟

خشک چھلکے والے ناریل سے وہ بچّوں کی طرح کھیلتی رہی۔ ارے ارے بادام کا چھلکا کتنا سخت ہے۔ ٹوٹتا ہی نہیں۔ کاغذی بادام ہوتے تو میں اب تک ختم کر چکی ہوتی۔ مٹھائی بھی پڑی ہے میں کیسے کھا سکتی ہوں؟ سسرال والے کیا کہیں گے؟

دولہا اب گھر پہنچ کر مجھ سے باتیں کریگا۔ اِدھر کھیتوں میں امریکن کپاس بوتے ہیں۔ بڑی بڑی پھٹیاں، ریشم کی طرح ملائم۔ دیسی دھرتی، حسین امریکن بیج۔ تو دولہا اب دلہن سے باتیں کیوں نہیں کرتا؟ کیوں نہ میں خود ہی اُسے بلالوں۔ اب آئندہ کبھی ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ دلہن راستہ بھر ڈولی میں قید رہے۔

ارے ارے سر پر سونے کا "چونک" تو کسی مندر کا کلس معلوم ہوتا ہے۔ یہ نتھ، یہ بلاق، یہ ماتھے کا جھومر، کانوں میں بالیوں کے گچھے! یہ سنگار تو بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ ماتھے کا جھومر ہی کافی نہ تھا؟ کہاں ہے۔ میرا وہ سنگار؟ کاش دولہا نے ایک مہینہ پہلے مجھے کھیتوں میں ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتے دیکھا ہوتا۔ کاش میں اُسی روپ میں آج بھی دولہا کے سامنے کھڑی ہو سکتی!

گاؤں کی سرحد آگئی۔ کہاروں نے پیپل کے نیچے ڈولی رکھدی۔ جہاں گاؤں کی عورتیں پہلے سے دلہن کا انتظار کر رہی تھیں۔

ڈولی کا پردہ اٹھا اٹھا کر لڑکیاں دُلھن کا روپ پرکھنے لگیں۔ دلہن کے سنگار کی تعریف سُن کر روٹھی ہوئی نائن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑنے لگی۔

تینوں نوجوان کہار پرے برات کے قریب سرک گئے۔

بوڑھا کہار ڈولی کے قریب ہی کھڑا رہا۔ وہ تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے کندھوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے کندھے پیتل کے نہ تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈولی بھی ایک پُل ہے۔ نہ جانے ابھی اور کتنی دلہنیں اسی پُل سے گذر کر میکے سے سُسرال پہنچیں گی۔

بھینٹ

چاند کی نکھری ہوئی چاندنی میں صاف و شفّاف ندی کے کنارے اپنی تمام روایتوں اور عظمتوں کا حامل پیگوڈا کھڑا تھا۔ اُس کی مخروطی چھت کسی ہادیٔ برحق کی آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی اُنگلی کی طرح یہ دکھاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی کہ یہ ہے صداقت کی راہ اور یہی ہے گیان کی منزل۔

بُدھ مندر کے سائے میں کھڑا ہوا بھکشو اِس سارے منظر سے متأثر اپنے ماحول اور زندگی سے مطمئن نظر آرہا تھا۔ وہ اسی طرح کی ایک چاندنی رات تھی۔ جب بُدھ نے جنم لیا تھا۔ اور ساری فضا ایک پیغام سے گونج اٹھی تھی —— اے مُردہ لوگو، جنھوں نے دوبارہ جنم لینا ہے اور اے زندہ لوگو، جنھوں نے ایک روز موت سے ہم آغوش ہونا ہے

اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ سنو، دنیا کا نجات دہندہ آن پہنچا۔ شانتی کا زمانہ آ گیا۔

بھکشو کی آنکھیں پیگوڈے کی مخروطی چھت کے ساتھ ساتھ آسمان کی طرف اُٹھتی چلی گئیں۔ جہاں پیگوڈے کا کلس روپہلی چاندنی میں چمکتا ہوا ایک تیز نیزے کی فروزاں انی کی طرح آسمانی بلاؤں کو آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔

بھکشو کی نظریں یہ کہتی معلوم ہوتی تھیں کہ اس نے آسمانی بلاؤں کو ہمیشہ دور رکھا ہے اور اب بھی اسمیں شکتی ہے۔ کئی زلزلے آئے، کئی بجلیاں گریں۔ مگر یہ ایک اٹل سپاہی کی طرح اپنے آدرش پر قائم ہے ـــــ لیکن جنگ؟ ـــــ کیا اس طوفان کو یہ سنہری کلس روک سکے گا؟ بُدھ نے کہا تھا ـــــ ہمیشہ انصاف کی فتح ہوتی ہے۔ کیا ہماری فتح نہ ہوگی؟ بُدھ نے یہ بھی کہا تھا کہ جنگ میں لاکھوں پر فتح پانے والے سے وہ کہیں بڑا ہے، جو اپنے آپ پر فتح پاتا ہے۔ اسی لئے بُدھ نے کہا تھا ـــــ میں بدھ جو کبھی رو رو کر آنسو بہاتا تھا، جس کا دل دنیا کے غموں سے ٹوٹ گیا تھا، آج ہنستا ہوں خوش ہوں کہ انسان کو آزادی نصیب ہو چکی ہے ... کیا یہ آزادی قائم رہ سکے گی؟

آج ایک جو اپنے آپ کو بودھی کہتا ہے، دوسرے پر، جو بودھی ہے، حملہ کر رہا ہے کیا یہ دیکھ کر بدھ پھر نہ روتا ہوگا؟ مگر بُدھ نے یہ بھی تو کہا تھا، دھرتی خوبصورت ہے۔ لیکن اس پر بسنے والے اوروں کی زندگی کے بھوکے ہیں۔ دوسروں کو مار کر خود زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ آج بھی دھرتی اُسی مصیبت میں گرفتار ہے۔

بھکشو کا سر جھک گیا۔ سر جھکائے وہ بُدھ مندر کے اندر بدھ کی مورتی کے سامنے

جا بیٹھا۔ گویا وہ اپنے دیوتا کو جگا کہ پھر وہی شانتی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اُس کے ذہن میں یکبارگی سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں پیگوڈے اُبھرنے لگے۔ مغموم شکستہ پیگوڈے۔ وقت کے بے رحم ہتھوڑے نے اِن کے کنگرے گرا دیئے تھے اُسے لوگوں کی ذہنیت پر غصہ آرہا تھا۔ جو بھی اُٹھتا ہے بدھ کی مورتی کے لیئے نیا پیگوڈا تعمیر کراتا ہے۔ پرانے پیگوڈے آہستہ آہستہ مٹتے چلے جارہے ہیں کیسی توہم پرستی ہے کہ پرانے پیگوڈے کی مرمت سے پُنیہ نہیں ملتا۔ اُس نے بڑے غور سے بدھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا معلوم ہوتا تھا بدھ بھگوان اُسے یہ حکم دے رہے ہیں کہ وہ ہر کہیں یہ اعلان کر دے۔ کہ پرانے پیگوڈے کی مرمت کرانے سے بھی بھگوان اُتنے ہی خوش ہونگے

اُس نے اپنے پھٹے ہوئے زرد لباس کا جائزہ لیا۔ وہ بھیک مانگ کر کھاتا تھا اور وہ بھی تیسرے پہر سے پہلے پہلے پورے بیس برس سے وہ بدھ کے بھکشو کی زندگی بسر کرتا آرہا تھا۔

اچانک باہر کے شور نے اُسے بیدار کر دیا۔ بے ہنگم، تیز آوازیں دم بدم بڑھتی چلی جارہی تھیں۔ اُسے پھر جنگ کا خیال آگیا۔ پُرشکایت نگاہوں سے وہ بدھ کی جانب دیکھنے لگا۔ یہ تیسرا پہر وہ عجیب آدمی ہے بھگوان، جو تیرے ہی بندوں پر بم برساتا ہے۔ توپ میں گولے بھر بھر کر پھینکتا ہے، ہزاروں زندگیوں کو تباہ و برباد کرتا ہے! اب پیگوڈے بھی کب محفوظ رہ سکتے ہیں؟

اُسے یوں محسوس ہوا جیسے بدھ کے چہرے پر نئے جذبات تھرک اُٹھے ہوں، جیسے

بھگوان کہہ رہے ہوں، بادرے بھکشو، ڈرنے کی کونسی بات ہے؟ پیگوڈے پر کوئی بم نہیں گرا سکتا۔

شور بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بہت سے گھبرائے ہوئے لوگ بُدھ مندر میں داخل ہو رہے تھے عجب افرا تفری کا عالم تھا۔ جیسے اُنہوں نے موت کو دیکھ لیا ہو۔ بچے بوڑھے جوان سب سہمے سہمے نظر آتے تھے۔ مرد عورتوں کو تسلیاں دے رہے تھے۔ بھکشو کی آنکھیں ہجوم کی طرف اُٹھیں اور پھر ایک بوڑھے کے چہرے پر جم گئیں جو اس وقت ان تمام دکھوں اور غموں کا آئینہ دار تھا، جنہوں نے گیان سے پہلے بُدھ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ پھر اُس نے بُدھ کی جانب دیکھا۔ ہے بھگوان! یہ تیرے بھگت تیرے بھگتوں سے بھاگ کر تیری شرن میں آئے ہیں، اور تیرا آسرا چاہتے ہیں ——

ماندلے کے آسمان پر ہوائی جہاز منڈلا رہے ہیں کوئی بولا۔ "آج پھر بمباری ہوگی"

"ہماری موت قریب ہے۔"

"موت؟ میں موت سے نہیں ڈرتا۔"

"شاید ہم بچ جائیں۔"

"ہاں، ہاں، ہم بچ جائیں گے" —— ایک بوڑھی، لڑکھڑاتی آواز دیئے کی لو کی طرح اُوپر کو لپکی۔ "ہاں، ہم بچ جائیں گے۔ بھگوان بُدھ ہمیں بچا لیں گے۔ بدھ مندر یا پیگوڈے پر تو وہ پاپی بم گرانے سے رہے۔"

بھکشو نے بڑے غور سے اِس جھکی ہوئی کمر والی بڑھیا کی طرف دیکھا۔ اُس

کی آنکھوں میں وشواش کی جوت چمک رہی تھی۔ اُسے بُدھ کی شکتی پر بھروسہ تھا۔ وہ بولا: "ہاں، ہاں، تم ضرور بچ جاؤ گے۔ بھگوان بُدھ تمہیں بچالیں گے۔"

بچوں اور عورتوں کی سہمی سہمی آوازیں نوجوانوں کی سرگوشیاں، ادھیڑوں کی بحثابحثی تین دریاؤں کی لہروں کی طرح جھٹ جھٹ ایکدوسرے میں سماتی جارہی تھی۔ اپنی دلپسند پراتھنا کے الفاظ بھکشو کے ہونٹوں پہ آگئے اُس نے بُدھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "یہ کیسی مصیبت ہے؟ بھگوان! ہمیں بچالو۔"

ایک بچہ اُس کے قدموں میں آگرا۔ اُسے پچکارتے ہوئے اُسے اپنے بچپن کے دن یاد آگئے۔ بچپن بیتا، جوانی بیتی۔ اب بڑھاپا بیت رہا ہے۔ پورے بیس برس سے مَیں اِس بُدھ مندر میں ہوں۔ ہر روز بُدھ بھگوان کے سامنے بیٹھتا ہوں۔ آج یہ بچہ بھی مرجائے گا اور مَیں بھی مرجاؤں گا —— مَیں، جو بچے سے بوڑھا ہوچکا ہوں اور یہ بچہ!... دیر تک وہ بچے کے سر پہ ہاتھ پھیرتا رہا۔

ایک ہفتہ سے کسی بمبار نے مانڈلے کا رُخ نہیں کیا تھا۔ آج صبح تک کسی کے شان گمان میں بھی نہ تھا کہ بمبار طیارے آئیں گے اور شہر پہ بم برسائیں گے۔ وہ ابھی خیالات میں بہا جارہا تھا کہ بچے کی ماں دوڑی دوڑی آئی اور بچے کو تھام کر ایکطرف کھسک گئی۔ اُس نے اُس عورت کیطرف دیکھا اور سوچا، آج یہ بھی مرجائے گی اور اس کا بچہ بھی۔ ایسی ہی عورت نے بھگوان بُدھ کو جنم دیا تھا۔ موت نے تو نہ بھگوان کا لحاظ کیا تھا، نہ اُن کی ماتا کا۔ لیکن بھگوان تو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور اُن کے اپدیش رات کی تاریکی میں امرت جیوتی بن

کر چمکتے رہتے ہیں۔ ہے بھگوان، اپنے بھگتوں کو بچا لو—— اپنے بھگتوں کی بمباری سے اپنے بھگتوں کو بچا لو!۔۔۔۔۔۔۔

بُدھ کی آنکھوں میں شانتی تھی۔ بھکشو کو یقین ہو گیا کہ پگوڈے اور مندر پر بمباری نہیں ہو گی۔ وہ اُن سے کہنا چاہتا تھا کہ ڈرو نہیں، بُدھ کے بھگتو، سمجھ لو کہ تم بچ گئے یہاں بم نہیں گریں گے۔ ایک لمحہ کے لئے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے دھرتی گھوم کر آسمان بن گئی ہو اور آسمان دھرتی کی جگہ آ گیا ہو اور بھگوان کی شکتی سے سب کے سب بم بیکار ہو گئے ہوں۔ بمباری کا سب ڈر جاتا رہا۔

وہ قریب کھڑے ہوئے لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ "پگوڈے اور مندر پر بم نہیں گر سکتے۔" اُس کی آواز مندر کے منڈپ کے آخری کونے تک گونج اٹھی ایک لمحے کیلئے ہوا میں خموشی سنسناتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک بم کہیں نزدیک ہی گرا اور لوگ پھر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

"بچ گئے سو بچ گئے، مر گئے سو مر گئے۔"

"بھگوان بُدھ کے چرنوں میں مرنے سے لابھ ہی لابھ ہے۔ یہی تو نروان کا مارگ ہے۔"

"ابھی تو میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن موت سے کون کشتی لڑ سکتا ہے۔"

"یہ آخری ملاقات ہے۔"

"ہاں آخری ملاقات ــــ ایک مسکراہٹ اور پھر موت۔"

"بھیڑوں کے گلے پر جیسے بجلی گرتی ہے ایسے ہی آج ہمارے اوپر بم گریں گے۔"

"ہم کمزور ہیں۔ ہمیں زندہ رہنے کا حق نہیں۔"

ہجوم کا شور خوفناک صورت اختیار کر گیا۔ دور کہیں بم گر رہے تھے۔ بھیانک آوازیں فضا میں چیخ رہی تھیں۔ لوگ بے زبان بتوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کہیں بچے رینگتے رینگتے یکبارگی سہم کر تھم گئے۔ ایک دوشیزہ کے کنوارے چہرے پر پورے برما کا نقشہ ابھر آیا۔ بھکشو نے سوچا۔ ابھی تو اس کے خدوخال اور بگڑیں گے۔ اب مانڈلے پر بھی دشمن کا قبضہ ہو جائے۔ دوشیزہ سے آنکھیں ہٹاتے ہوئے بھکشو نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس دوشیزہ کے کان میں کہے۔ برما کی پت نہیں اُتر سکتی یہاں دشمن کا قبضہ نہیں ہوگا۔

ایک بار پھر فضا میں نہایت خوفناک آوازیں گونج اُٹھیں۔ ہجوم میں افراتفری پھیل گئی۔ بھکشو کی شکایت بھری نگاہیں بدھ سے پوچھ رہی تھیں۔ کیوں، بھگوان یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا اب تیرے پگوڈے اور مندر پر بھی بم گریں گے؟

معاً کوئی شے اُس کے چہرے سے ٹکرائی اور خون کی دھار سے لت پت آنکھیں جھپجھپاتے ہوئے اُس نے دیکھا۔ یہ اُس بچے کا سر تھا۔ جسے چند لمحے پہلے وہ عورت اُس کے آغوش سے اُٹھا لے گئی تھی۔

خوفناک آوازوں اور گونجوں کے درمیان بھکشو نے سراسیمگی کے عالم میں اِدھر

فینٹ

اُدھر دیکھا، بیسیوں انسانی سر، ٹانگیں، بازو، چھوٹے بڑے ہاتھ، مردوں اور عورتوں

کے دھڑ ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

اِس خوفناک منظر سے گھبرا کر اُس نے اپنے اِسٹنٹ دیو کی طرف آنکھیں اُٹھائیں

مگر اُس کی سہمی ہوئی نظریں اپنے بھگوان کے قدموں سے نہ لپٹ سکیں۔

بھگوان!۔۔۔ ایک چیخ کے ساتھ اُس نے بھگوان کے سر کو اپنے سینے سے

لگا لیا۔

تھکے ماتھے، پھٹے حال، وہ چلے جا رہے تھے۔ اُنہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ اُن کی

منزل کہاں ہے۔ وہ اِس طرح آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے، جیسے اُن کے

مقدر میں ہمیشہ کے لئے چلنا ہی لکھا ہو۔ تباہی و بربادی کے منظر ابھی تک اُن کی آنکھوں

کے سامنے گھوم رہے تھے۔ تن کے کپڑوں اور چھوٹی چھوٹی پوٹلیوں کے سوا، جن میں شاید

کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ ان کے پاس اور کچھ نہ تھا۔

اُس راستے سے پہلے بھی ایسے کئی قافلے گزر چکے تھے اور یہ راستہ اُنہی قافلو

کا بنایا ہوا تھا۔ پہلے کبھی ان بھیانک جنگلوں اور کٹھن پہاڑیوں سے انسان کا گزر نہ ہو

تھا۔ یو قد ساگوانوں کے ساتھ ساتھ اُن کی نگاہیں آسمان کی طرف رینگتی ہوئی معلوم ہوتیں

جیسے وہ خالق کو اُس کی تخلیق سے متعارف کرانا چاہتی ہوں لیکن ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی نگاہیں آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے تھک ہار کر یہ فیصلہ کر چکی ہیں کہ اُوپر دیکھنا بیکار ہے۔ اُس کے پھٹے ہوئے زرد لباس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی پیگوڈے کا بھکشو ہے۔ اُس کی پُشت پر بید کا بکس بندھا ہوا تھا۔ وہ اس قافلے کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔

اُترتی چڑھتی پگڈنڈی پر یہ قافلہ آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ کہاں جائیں گے؟ اِس جنگل کے اُس پار دوسرے جنگل میں، دوسرے جنگل کے اُس پار تیسرے جنگل میں۔ ہارے ہوئے سپاہیوں کی طرح یہ پناہ گزین کسی ان دیکھی منزل کی طرف جا رہے تھے اپنے شہر کی گلیوں اور بازاروں سے دُور ـــــ اُفق کے اُس پار۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ کب لوٹیں گے۔ لوٹیں گے بھی یا نہیں۔

بھکشو کی طاقت سلب ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ [illegible] آگے چلنے سے انکار کر رہا تھا۔ اُس کی انتڑیاں بھوکی تھیں۔ مگر وہ ان لوگوں سے کیسے بھکشا مانگتا جن کے پاس اپنے لئے بھی کچھ نہ تھا؟

وہ ذرا رُک کر نروان مارگ کے منتر کا جاپ کرنے لگا ـــــ میں بُدھ کی شرن میں جاتا ہوں، دھرم کی شرن میں جاتا ہوں، سنگھ کی شرن میں جاتا ہوں . . . . . پھر اُسے سنگھ یا ملت کی کم مائیگی کا خیال آیا۔ ہاں یہ سب سنگھ کی کمزوری ہے کہ ایک بودھی دیس دوسرے بودھی دیس پر دھاوا بولتا ہے۔ دونوں بھگوان کے نام لیوا ہیں ـــــ بُدھ بھگوان

کے نام لیوا ـــــ بُدھ بھگوان کے نام لیوا! ـــــ یہ جنگ کیسی؟ اِس بربریت کا مطلب؟
آج بم برستے ہیں۔ توپوں سے گولے چھوٹتے ہیں۔ دنادن گولیاں چلتی ہیں۔ دھواں اُٹھتا
ہے۔ شعلے لپکتے ہیں مسکراہٹیں، قہقہے، سُہاگ، زندگی کے عہد و پیمان سب ختم ہو رہے ہیں
باپ کی شفقت، ماں کی مامتا بموں کے نیچے ریزہ ریزہ ہو رہی ہے۔ اور پھر اپنے دماغ
سے باتیں کرنے کی بجائے وہ قافلہ والوں کی باتیں سننے لگتا۔

"جانے موت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔"

"اس پگڈنڈی پر سے پہلے بھی بپتا کے مارے گزرے ہوں گے۔"
کبھی کبھی بھکشو کو اپنی زندگی بجھے انگارے کی طرح ٹھنڈی پڑتی محسوس ہوتی۔

رات کے سناٹے میں چیخیں سنائی دیتیں، جیسے بھگوان رو رہے ہوں۔
کئی دن کئی راتیں اسی طرح گزر گئیں کئی سنگی ساتھی راستے ہی میں چھوٹ گئے
قافلہ اپنی ان دیکھی منزل کی جانب جا رہا تھا۔ بھکشو کے ذہنی افق پر دائرے اُبھرنے
لگتے ـــــ زندگی اور موت کے دائرے۔ ان دائروں میں بھگوان کا مسکراتا ہوا چہرہ
یکبارگی مغموم ہو اُٹھتا۔ اپنے زرد لباس کی طرف وہ اُچٹتی نگاہوں سے دیکھتا۔ میں
بھی کیا خاک بھکشو ہوں؟ میری تیس برس کی پوجا بیکار چلی گئی۔ بھگوان مجھ پہ ناخوش
ہیں۔ مجھے چاہیئے تھا بم گرنے سے پہلے بھگوان کے جسم سے چمٹ جاتا اور اُن کا سر
اُڑنے سے پہلے میرا جسم ریزہ ریزہ ہو چکا ہوتا۔
اُسے بار بار پیگوڈے اور مندر کا دھیان آتا جہاں اُس نے اتنے برس بُدھ کی

پوجا میں گزارے تھے۔ مندر کا دروازہ اُس کے ذہن میں اُبھرنے لگتا ــــ زندگی کا دروازہ! اسی دروازے سے گزر کر بھگوان کے درشن کیئے جا سکتے تھے۔ اُس وقت اُس کے اُداس دل میں تازگی سی آ جاتی۔ مندر سے نکل کر جیسے بھگوان دروازے پر کھڑے ہو گئے ہوں۔ اور اسے اپنی طرف بلا رہے ہوں۔ بھگوان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل اُٹھتی۔ اور اُسے خیال آتا کہ وہ واپس چلا جائے۔ اور قافلے والوں کو بھی سمجھائے کہ بھگوان اُنہیں بلا رہے ہیں۔

قافلے کو آگے ہی آگے چلنا منظور تھا۔ جیسے نغمہ کے معصوم سُر عروج پر پہنچنے میں کوشاں ہوں، جیسے خیالات کا ہجوم اعتقاد کی سطح تک اُبھرنے چلا ہو۔ وہ کس قدر دور نکل آئے تھے۔ پیگوڈے سے دُور، ایراوتی سے دُور۔ اُسے اُن نغموں کا خیال آتا جو ایراوتی کے ملّاحوں کے ہونٹوں پر تھرک اُٹھتے تھے۔ ان ترانوں میں وہ بُدھ کے گُن گاتے تھے۔ جانے اب کبھی وہ نغمے سننے کو ملیں گے یا نہیں۔ بھکشو کو اپنے قدم بوجھل محسوس ہونے لگے۔

آگے ہی آگے، کبھی اُوپر کبھی نیچے ــــ انجانی خلاؤں میں زندگی کا کارواں رواں دواں نظر آتا تھا۔ یہ لوگ گا تو نہ سکتے تھے۔ اُن کے کپڑے میلے، ان کے پاؤں زخمی کبھی وہ بھی رنگ رلیاں مناتے تھے۔ لیکن اب اُنکے ذہن تاریک سے تاریک تر ہوتے جاتے تھے۔ دوشیزاؤں کے گالوں پہ گلاب مرجھا کر رہ گئے تھے۔ یہ کیسی خزاں تھی؟ ان کے ارادوں پہ موت کے سائے پھیل رہے تھے۔

جیسے پگڈنڈی نے ابھی ابھی انگڑائی لی ہو۔ اوپر پہاڑ پہ بل کھاتی پگڈنڈی کی طرف کھبتی ہوئی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بھکشو سوچنے لگا۔ جانے یہ پگڈنڈی کہاں ختم ہو گی؟ جانے یہ کہیں ختم ہو گی بھی یا نہیں؟ بھکشو کے سینے میں طوفان سا اُٹھ رہا تھا۔ پگڈنڈی پر اُداسی چھا گئی، جیسے وہ بیمار مغنیہ ہو اور ایسے میں اُس کے ہونٹوں پر کوئی نغمہ نہ تھرک سکتا ہو۔ پرانے قدموں کے نشان کسی پہلے قافلے کا افسانہ سنا رہے تھے۔ ان پر بچ بچ کر قدم رکھتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا —— بُدھ کا اُداس بھکشو —— قافلے کے ساتھ لیکن قافلے سے الگ۔

بُدھ گیا کا سر بفلک مندر جو پرانے [illegible] ایک دیو ہیکل نقیب کی طرح کھڑا زبانِ حال سے پکار پکار کر دور دور کے لوگوں سے یہ کہتا معلوم ہوتا تھا کہ آؤ اے دنیا والو! اگر تم دنیا کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے پناہ چاہتے ہو تو یہاں آؤ... اگر تم اپنی منزل کا راستہ بھول گئے ہو تو یہاں آؤ۔ اگر تم نروان چاہتے ہو تو یہی وہ جگہ ہے جہاں ہر کسی کو آنا ہو گا۔ یہاں ہر کسی کو پناہ ملے گی گیان اور نروان ملے گا۔ اور شاید اس نقیب کی پکار سن کر ہی ہزاروں چلے آ رہے تھے۔ پگڈنڈیوں پر، گھوڑوں پر، چھکڑوں پر، بیل گاڑیوں میں، پیدل، دیوانہ وار۔ پُرشکوہ مندر کی عالیشان عمارت کا رعب اُن کے

دل و دماغ پر کچھ اتنا غالب تھا کہ وہ یہی سوچ کر رہ جاتے کہ اس کے سامنے انسان کی ہستی ہی کیا ہے۔

ایک نئے بیاہے جوڑے نے مندر کے سامنے کھڑے ہو کر نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا چاہا، یہ ماننا ہی ہوگا کہ بدھ گیا کے مندر کے مقابلے میں ہم بالکل ایسے ہی ہیں جیسے پورے قد والے انسان کے سامنے دو چیونٹیاں دلہن شرما گئی۔ لیکن دولہا مسکرایا اور آہستہ آہستہ اس کی مسکراہٹ معنی خیز قہقہے میں پھوٹ پڑی۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ کوئی کچھ بھی کہے یہ مندر انسان کے مقابلے میں ہیچ رہے گا۔ کیونکہ ہمارے بزرگوں نے ہی تو اپنے ہاتھوں سے اسے کھڑا کیا تھا۔

دلہن اور بھی شرمانی چلی گئی۔ جیسے وہ یہ کہنا چاہتی ہو، ہاں ضرور تمہارے مقابلے میں ہیچ ہوں۔

وہ پرے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ لیکن وہیں کھڑی رہی۔ ایک اچٹتی سی نگاہ اس نے اوپر سیڑھیوں پر پھینکی اور پاؤں سے نچلی سیڑھی کو ٹھوکا دیتی رہی۔ اس کے چہرے پر بے چینی کی شکنیں ابھریں۔ وہ چاہتی تھی کہ سب سے پہلے اوپر مندر میں پہنچ کر بھگوان کے درشن کیئے جائیں تاکہ ان کے اشیرباد سے وہ ایک دن بیٹے کی ماں بنے لیکن اب وہ دولہے کو کیسے سمجھائے کہ مندر کے چوکھنڈے شکھر اور سنہری کلس کی طرف ایک مورکھ کی طرح ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہنے سے کیا مل سکتا ہے۔

شِکھر اور کلس سے پھسل کر نوجوان کی نگاہیں دلہن کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ پھر مسکرایا۔ جیسے کہہ رہا ہو: میں جانتا ہوں، تم بھگوان سے کچھ مانگنا چاہتی ہو لیکن میں پوچھتا ہوں بھگوان کے لئے تم کیا لائی ہو۔

دُلہن نے نظریں چرا کر ایک خمیدہ کمر یاتری کی طرف دیکھا جو آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب ہی سیڑھی پر بیٹھ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے اس شخص کے زرد کپڑوں کی طرف دیکھ کر دھیان آیا کہ ابھی سے آشیرباد مانگ کر گھر چلی جائے۔ اگر وہ کہے کہ آشیرباد تو مانگتی ہو مجھے کیا دو گی تو وہ جھٹ کہہ اٹھے گی ۔۔۔ بُڑھا ہاں بسا دھو۔ مجھے پھل چاہیئے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اس کی طرف قدم اٹھاتی، دولھا نے اس کا بازو کھینچا اور وہ دونوں بھیڑ میں جانے کہاں گم ہو گئے۔

سیڑھی پر بیٹھے بیٹھے یاتری نے محسوس کیا کہ وہ اس ماحول میں اجنبی ہی تو ہے۔ سہمی سہمی نظریں اس نے دائیں بائیں گھمائیں لیکن اُسے کوئی مانوس چہرہ نظر نہ آیا۔ اُس نے اپنی کمر پر سے چادر ہٹائی جس کے نیچے بید کا بنا ہوا بکس تھا، جو رسیوں سے اُس کے جسم کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ رسیاں کھول کر ادب سے اُس نے بکس کو اپنے پہلو میں رکھا اور وہ شِکھر کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی رینگتی ہوئی نگاہیں کلس پر پہنچ کر رُک گئیں۔

لوگوں کا ایک ہجوم بھجن گاتا ہوا پاس سے گزر گیا، بھکشو نے سوچا، یہ لوگ کتنے خوش ہیں۔ ہجوم میں اُسے اپنی تنہائی بُری طرح کھٹک رہی تھی، اُس نے سوچا میں

بھلا بھگوان کا معمولی سا سیوک ہوں۔ مجھے تو بھلا یہ لوگ کیا اپنائیں گے؟ یہ تو بھگوان کو بھی نہ پہچان سکیں جنہیں اس جگہ گیان حاصل ہوا تھا۔ اور جن کی یادگار کے طور پر اشوک نے یہ عالیشان مندر تعمیر کرایا تھا، لوگوں کا شور بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔

"یاتری!" —— اس آواز نے بھکشو کے خیالات کا سلسلہ توڑا۔

کوئی ہمدردانہ لہجے میں اسے متوجہ کرنے کی کوشش میں تھا۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر بلانے والے کی طرف دیکھا۔

"میں اس مندر کا پجاری ہوں یاتری۔ شاید تم بہت دور سے آئے ہو"

"ہاں بہت دور سے، دور برما دیس سے"

"برما سے؟"

اُس نے سیڑھی سے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن پجاری بولا: "تم بہت تھک گئے ہو یاتری آرام سے بیٹھے رہو۔ ہم بھگوان کے درشن کریں گے"

پجاری کی نگاہیں بھکشو کے بکس پر تھیں۔ بھکشو نے معنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں کے کونوں تک لاتے ہوئے کہا: "میں بھگوان کے لئے بھینٹ لایا ہوں"

"بھگوان کے لئے بھینٹ!" پجاری کا چہرہ کھل اٹھا "چلو چل کر بھگوان کے درشن کریں"

بھکشو نے آہستہ سے کہا: "لیکن پہلے مجھے بودھی برکش کے نیچے لے چلو جہاں بھگوان کو گیان حاصل ہوا تھا"

"بودھی برکش؟ وہ برکش اب کہاں ہے یاتری؟"

"وہ برکش نہیں رہا؟"

"اس برکش کا بیج ہمارے دل میں پڑا۔ اور اب تو ہم بھی گویا بودھی برکش ہیں۔ لوگ ہم سے گیان لینے آتے ہیں۔"

"بودھی برکش کیسے مٹ سکتا تھا؟ جب تک بھگوان کا نام زندہ ہے، بودھی برکش بھی زندہ رہے گا۔"

"ہاں ہاں بودھی برکش زندہ رہے گا۔ جب تک بھگوان کا نام زندہ ہے اس برکش کی اولاد اسی جگہ موجود ہے۔ چلو میں تمہیں دکھاتا ہوں یاتری۔"

بھکشو نے بکس کندھے پر اٹھا لیا۔

ایک درخت کے نیچے پہنچ کر پجاری بولا۔ "ٹھیک اسی استھان پر تھا وہ برکش۔" بھکشو نے آنکھیں بند کرلیں اور بکس نیچے رکھ کر بکس کے سامنے جھک گیا۔ یک لخت وہ کہہ اٹھا: "نہیں — یہ نہیں — وہ سامنے۔" اور بکس اٹھا کر وہ بڑی تیزی سے دوسرے درخت کے نیچے چلا گیا۔ سائے کی طرح پجاری بھی پیچھے پیچھے آپہنچا۔

بکس رکھ کر بھکشو بیٹھ گیا۔ اور بولا "ہاں یہی ہے وہ استھان۔" ایک بار پھر اس نے سمادھی میں آنکھیں بند کرلیں، وہ بھگوان کو ساکشات اسی حالت میں آلتی پالتی مارے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ جب انہیں اسی جگہ گیان حاصل ہوا تھا۔

پجاری کی نگاہیں برابر بھکشو کے بکس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ضرور

اس بکس میں کوئی قیمتی چیز بند ہے۔ اور برما میں تو ہیرے بھی ہوتے ہیں۔ شاید اس یاتری کو بھی کہیں سے دو چار ہیرے مل گئے ہوں۔ پہلے وقتوں میں تو بڑے بڑے بڑے راجے مہاراجے ہی ہیروں کی بھینٹ لایا کرتے تھے۔ اس نے دور سے مندر کے تیوہار کی رونق بڑھانے والے ہجوم کا جائزہ لیا۔ بہت سے لوگ مندر کی پرکرما کر رہے تھے۔ ان میں ہر عمر کے لوگ موجود تھے۔ بچے بوڑھے، جوان عورتیں اور مرد۔ وہ سب بھگوان کے بھگت تھے۔ سمادھی میں بیٹھے ہوئے بھکشو کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوچا، ایسے یاتری تو روز نہ روز نہیں آتے۔ اُن کی سو بھینٹیں، اس کی ایک بھینٹ۔

جُونہی بھکشو نے آنکھیں کھولیں۔ پوجاری بولا۔ "چلو اب مندر چلیں، یاتری"

دونوں مندر کی جانب چل دیئے۔ انہوں نے دیکھا کہ اُمڈتا ہوا ہجوم مندر کے قریب جمع ہو گیا ہے۔ جیسے رنگ رنگ کی لہریں ایک مرکزی نقطے پر کوئی اچھا سا نمونہ کاڑھنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ ہجوم کا شور الگ کسی نغمے کا سرگم تیار کر رہا تھا۔

پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی بھکشو رُک گیا۔ اُس نے ہجوم پر نظر دوڑائی لوگ بڑے امن اور شانتی کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ پھر اس کی نگاہیں مندر کے شکھر کی طرف اُٹھ گئیں۔ کلس دھوپ میں چمک رہا تھا۔ جیسے وہ روشنی کا ایک بلند مینار ہو۔ جو دنیا کے گم کردہ راہ مسافروں کو اپنی روشنی سے ان کی منزل کا راستہ دکھا رہا ہو۔ بے خودی کے عالم میں وہ بول اُٹھا، "بھگوان! اتنا فرق! وہ بھی مندر تھا،"

یہ بھی مندر ہے۔ وہ بھی ہجوم تھا، یہ بھی ہجوم ہے۔ وہ تیری پناہ میں آئے تھے انہیں پناہ نہ مل سکی۔ یہ گیان حاصل کرنے آئے ہیں، کیا انہیں گیان حاصل ہو رہا ہے؟"

پوجاری نے حیرت سے پوچھا: "کیا کہا یاتری؟"

لیکن بھکشو پوجاری کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہتا چلا گیا" وہاں کے انسان الگ تھے یا یہاں کے بھگوان الگ ہیں؟ انہوں نے صرف تم پر بھروسہ کیا بھگوان! وہ صرف تمہاری شرن میں آئے اور وہ بچ نہ سکے۔ تو کیا اس کا یہ ارتھ ہے کہ اہنسا بھی وہی کر سکتا ہے۔ جو اپنی رکشا کے لئے ہنسا کرنے کا بل رکھتا ہو؟ تیرے بھگت کہلانے والوں نے تیرے بھگتوں پر بم برسائے۔ تیرے پگوڈے اور مندر پر تباہی کی آگ برسائی ـــــ اور وہیں سے میں تمہارے لئے تمہاری بھینٹ لایا ہوں بھگوان!"

پوجاری بولا: "تو چلو، یاتری! ـــــ دیر کا ہے کی؟ ـــــ بھگوان ہمارا انتظار کر رہے ہونگے۔"

بھکشو کے چہرے پر روشنی جھلک اٹھی تھی۔ گویا اُسے اس سیڑھی پر گیان حاصل ہوا تھا۔ اس کی سب داماندگی دور ہو چکی تھی۔ پوجاری کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پر وقار آواز میں کہا، "چلو چلیں۔"

وہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ مگر بھکشو کے لئے یہ سیڑھیاں نہ تھیں، نروان کی منزلیں تھیں جو وہ طے کر رہا تھا۔

مندر کے دروازے پر پہنچ کر بھکشو ٹھٹکا۔ اس نے دیکھا کہ وہی دلہن جس کا بازو تھام کر اس کا خاوند ہجوم میں گم ہو گیا تھا۔ بھگوان کے سامنے ہاتھ جوڑے کہہ رہی تھی: "اپنے جیسا ایک بیٹا مجھے بھی دے دو، بھگوان" اور پاس کھڑا اس کا شوہر بھی ایک لمحے کے لئے جھک گیا جیسے کہہ رہا ہو، کرپا کرو، بھگوان۔

میاں بیوی باہر نکلے تو پوجاری کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ پوجاری بولا: "جاؤ بٹیا، اگلے تیوہار پر دوسے تین بن کر آنا میرے آشیرباد سے بیٹا ہی ہوگا۔ میرے لئے بھینٹ لانا نہ بھول جانا۔"

بھکشو کی آنکھوں کے سامنے پیگوڈے اور مندر کا وہ منظر پھر گیا، جب خون میں لت پت ایک بچے کا سر اس کے چہرے کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے بھگوان کی مورتی کو نمسکار کیا۔ آلتی پالتی مارے بھگوان شانتی کے اوتار معلوم ہوتے تھے جیسے انہیں برما میں اپنے بھگتوں پہ بم باری کا کوئی علم ہی نہ ہو۔

بھکشو بکس پہ کانپتا لرزتا جھکا اور پھر چکرا کر گر پڑا۔

پوجاری نے لپک کر بکس کا ڈھکنا اٹھایا اور بدھ کا کٹا ہوا سر دیکھ کر ناک سکوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

جشن

رات بھر کے سفر کے وہ چھاؤنی کے دروازے پر پہنچے۔ جنگل بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ لیکن دھنشیا کو چڑھتے سورج کی کرنیں یہاں بھی میٹھی معلوم ہوئیں اور اُس نے دائیں بائیں کھلتی نگاہوں سے دیکھ کر کہا: "ارے تیرتھو اور منگلو یہاں بھی دھوپ میں دُودھ کے چھینٹے اور کاتک کے شہد کی بوندیں ملا رکھی ہیں۔ دیوی ماتا نے۔ کیوں میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

تیرتھو اور منگلو مسکرا دیئے۔ "دھن سکھ کہہ دے تو ہم بھی مان لیں۔"

دھن سُکھ پاس کھڑا ارجن کے اگنی بان کا ایک قصّہ سن رہا تھا۔ تیرتھو اور منگلو کی بات سن کر چونکا اور بولا: "کیا کہہ رہا ہے ہمارا سنسار؟ سب خوش تھے

کمان افسر آئے گا تو آجائے ارے ہماری باتیں تو ہماری اپنی باتیں ہیں۔ جنگل کی باتیں۔ جنگل جہاں شیر ہوتے ہیں۔ جنگل جہاں ہمارا راج ہے۔ جنگل جہاں رانا پرتاپ نے ہماری آؤ بھگت کی تعریف کی تھی۔"

کالے بھجنگ، ہٹیلے غصیلے بھیل، جن کے جسم پر لنگوٹی اور گلے میں مونگوں کی مالا تھی۔ اپنا اپنا دھنش بان سنبھالے کھڑے تھے۔ اُن کے سردار دھنشیا کے سر پر پگڑی بندھی تھی ——— وہی پگڑی، جو کسی زمانے میں ودھیا رہی ہوگی، اور اب میٹیلی کی حد سے گزر کر کچھ کچھ کالی ہو چلی تھی۔ اُن کے جسموں پر طرح طرح کے چھوٹے موٹے گُدنے گُدے تھے۔ دھنشیا نے اپنے سینے پر پورا مور گدا رکھا تھا جو اس بات کی علامت تھا کہ وہ موری بھیلوں کا سردار ہے، جن کی عورتیں جنگل میں مور کو دیکھ کر سوا گز کا گھونگھٹ نکال لیتی ہیں، جو بیاہ پر مور کی مورتی کی پوجا کرتے ہیں، جو بیاہ پر مور کی مورتی کی پوجا کرتے ہیں، کبھی مور کو نہیں مارتے، کبھی اس کے قدموں کے نشان پر قدم نہیں رکھتے۔

دھنشیا نے بھیلوں کو سمجھایا تھا کہ ہو نہ ہو خطرہ قریب ہے۔ پہلے کب آسمان پر ہوائی جہازوں کی ٹولیاں نظر آتی تھیں۔ بہت ہوا کبھی کبھار کوئی اکا دکا جہاز نظر آ گیا اور اب تو خبر اُڑ رہی ہے کہ دشمن بہت قریب آ پہنچا ہے۔ ایک روز وہ ہمارے جنگل کو بھی آگ لگا دے گا۔ اس وقت دھنش بان کس کام آئیں گے؟ اسی آگ کو روکنے کے لئے انہوں نے فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

کمان افسر نے باہر آکر قطعی فیصلے کے انداز میں کہا، "تم لوگ شوق سے بھرتی ہو سکتے ہو لیکن یہ دھنش بان پھینک دینے ہونگے۔ ان سے یہاں کام نہیں چلے گا۔"

دھنشیا نے آگے بڑھ کر جواب دیا، "میری آنکھیں باندھ دو۔ میں صرف آواز سن کر نشانہ پر تیر مار سکتا ہوں۔"

تیر بھتو بولا، "ارجن کا اگنی بان ابھی تک الوپ نہیں ہوا۔ اب بھی تیر چلا کر آگ لگائی جا سکتی ہے۔"

منگلو نے شہ دی: "اور ارجن کا برکھا بان بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ تیر چلا کر برکھا برسائی جا سکتی ہے۔ لیکن نشانچی چاہیئے۔"

دھن سکھ نے سر دھنتے ہوئے کہا: "میں ایسا تیر مار سکتا ہوں کہ سیر سیر بھر کے اولے گرنے لگیں اور ہمارے دشمن ان کے نیچے دب جائیں۔"

کمان افسر لمبی بحث میں نہ پڑنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا، "تم یہ کہتے ہو۔ میں یہ سمجھتا ہوں اب تو بندوق بھی بیکار نظر آتی ہے۔ مشین گن اور توپ بھی چند روز کی مہمان ہیں۔ در اصل یہ جنگ تو ہموں کے بل بوتے پر لڑی جا رہی ہے۔"

دھنش دھاری بھیل ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ بندوق کے کرتب تو انہوں نے بہت سُن رکھے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ دھنش بان بندوق کو ہرا سکتا ہے۔ توپ اور مشین گن کی کہانیاں ابھی تک جنگل کے لئے اچھوتی تھیں اور بموں قصہ تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

کمان افسر نے موقع دیکھ کر پھر کہا۔ "تمہاری بہادری ہمارے سر ماتھے پر۔ تم بہادر بھیلوں کے بیٹے ہو۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ لیکن تمہیں زمانے کے مطابق چلنا ہوگا۔ تمہاری بہادری کھرے سکتے کی طرح چلے گی۔"

بھیلوں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ دھنشیا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اس نے سب بھیلوں کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔ سب اس کے حکم کے منتظر تھے وہ چاہتا تھا کہ سب خاموش رہیں لیکن کسی نے آہستہ سے کہا۔ "یہاں دھنش بان کا اپمان ہو رہا ہے۔" اور پاس کھڑے بھیل نے اس کا کندھا جھٹک کر کہا۔ "یہ ہمارے بزرگوں کا اپمان ہے۔" پرے سے آواز آئی۔ "جنگل پر ہمیشہ دھنش بان کا راج رہا ہے" اور سامنے سے کسی نے شہ دی۔ "ہاں، ہاں اُتر، دکھن، پورب، پچھم، ہمیشہ دھنش بان ہی سے بڑے بڑے شکار کھیلے گئے ہیں۔"

لیکن دھنشیا نے سب بھیلوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں سب منظور... تم جانتا زمانہ بہادروں کے لڑیت بیٹے ہو۔ یہ تو ایک زمانہ جانتا ہے۔ مجھے تم... سے یہی امید تھی۔" کمان افسر نے فتحیابی کے احساس سے سر گھماتے ہوئے کہا۔ دھنش... نے آگے بڑھ کر زمین پر دھنش بان رکھتے ہوئے پیچھے مڑ کر بھیلوں کے چہروں پر... ڈالی۔ منگلو بولا۔ "سردار کا فیصلہ ہمیں منظور ہے۔"

تیر تھو نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "سب اپنا اپنا دھنش سردار کے دھنش کے اُوپر رکھ دیں۔"

دھن سکھ نے شہ دی۔ "سردار کہے تو ہم اندھے کنوئیں میں کود جائیں۔"

سب بڑھ بڑھ کر دھنش بان زمین پر رکھتے چلے گئے۔ سردار کوئی آج سے تو سردار نہیں بنا۔ برسوں سے ہم اس کا حکم مانتے آئے ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ "سردار دن کو رات کہے تو وہ بھی ہمیں منظور ہے۔"

لیکن کچھ لوگ اپنا اپنا دھنش بان اُٹھا لینا چاہتے تھے۔ دھنش بان کا اپمان انہیں بُری طرح کھٹک رہا تھا، آج تک کسی نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ایک روز وہ دھنش بان تیاگ دیں گے۔

کمان افسر نے کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کھرا سونا کسوٹی پر چڑھتے کب ڈرتا ہے؟"

آخر انہیں اندر پہنچایا گیا۔ نہانے کو صابن اور تیل دیا گیا، لنگوٹی اتروا کر فوجی لباس پہنایا گیا۔ فوجی کھانا کھاتے ہوئے وہ دھنشیا کی طرف دیکھتے رہے مینگلو کہہ رہا تھا۔ "یہ سب تمہارے کارن ہے سردار —— سب تمہارے کارن۔"

تیر تھو نے کہا: "جنگل سے چلتے وقت دائیں ہاتھ گھوڑا ہنہنایا تھا۔ یہ سب اسی کے کارن سمجھو۔"

دھن سکھ نے بھی سُر سادھنا ضروری سمجھا۔ بولا: "اور جنگل میں مور بھی تو بول اُٹھا تھا۔ یہ سکھ اسی کے کارن ملا ہے۔"

دھنشیا بولا۔ "کیوں مجھے چھیڑ رہا ہے، دھن سکھ؟ یہ تو ہر کوئی جانتا ہے۔ کہ میں موری بھیل ہوں —— مور کی آواز پر سو سو بار بلہار ہونے والا۔"

پھر کسی نے چمک کر کہا "لیکن مور کی آواز سے تو مینہ کا پتہ چلتا ہے"

چاروں طرف قہقہے بلند ہوئے اور دھنشیا نے کہا "اب ہم سپاہی ہیں۔ ہم جنگ کی آگ بجھانے جائیں گے"

"موسلا دھار مینہ برسے گا تو خود بخود آگ بجھ جائے گی" پھر کسی نے منگلو کو چھیڑنے کے لئے بھوریا بھیلوں پہ مذاق کس دیا "بھوریا ٹھبک تومڑی چٹک، تومڑی میں سانپ نکلیو۔ بھوریا کیو۔ یے مہارو باپ نکلیو"

دھنشیا نے سمجھایا کہ بھوریا اور موری کی تمیز چھوڑو۔ یہ ٹھیک ہے کہ بھوریا بھیلوں کا پہلا بزرگ بھبوت رما کر جوگی بنا بھٹکتا تھا۔ اور اس کی تومڑی ٹوٹ گئی جس سے بھورے رنگ کا سانپ نکلا۔ اس نے کہا یہ میرا باپ ہے اور اب بھوریا بھیل نہ کدّو کھاتے ہیں جس سے تومڑی بنتی ہے اور نہ سانپ کو مارتے ہیں لیکن سب بھیل بھائی بھائی ہیں۔ رواج اور تیوہار تھوڑے جُدا جُدا بھی ہوئے۔ تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اب میرے کہنے سے فوجی لباس پہنا ہے تو میری لاج رکھنا بس آج سے یاد رہے کہ بلوال ہو چاہے پارگی، دامور ہو چاہے ڈھولی اور یہ راٹھیا سیمیلیا، ناتر اور ریاریلا، سب بھائی بھائی ہیں۔ ہم جنگل کو آگ کی لپٹوں سے بچانا چاہتے ہیں ——— جنگل جس کی کوکھ سے ہم جنمے اور جس کی گود میں ہم بچّے سے سیانے ہوئے۔

جب وہ محاذ پر بھیجے گئے تو فوج آسام کی سرحد سے بہت دور برما میں بڑھ چکی تھی۔ مانڈلے کے بعد رنگون بھی فتح ہو گیا۔ ٹھس ٹھس ٹھس، وہ گولیاں چلاتے وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر مورچہ پر جاتے۔ دن دن بھر ڈٹے رہتے۔ انہیں یقین تھا کہ اب یہ آگ بجھا کر ہی گھر لوٹیں گے۔

دھنشیا نے کمان افسر سے پوچھ کر اپنا دھنش بان ساتھ رکھ لیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ کمان افسر نے ہنس کر کہا تھا۔ "ہاں، لے لو۔ کبھی کبھی اسے دیکھ لیا کرنا۔ شاید یہ پڑا پڑا کبھی تمہارے کام آجائے۔" بندوق چلاتے وقت اسے اپنے اوپر ہنسی آنے لگتی۔ اب یہاں دھنش بان کیا کر سکتا ہے؟ یہاں تو کبھی کبھی بندوق بھی بیکار نظر آتی ہے۔ اور مشین گن اور توپ سے بھی وہ کام نہیں بنتا، جو بم گرا کر کیا جا سکتا ہے۔ کمان افسر سچ کہتا تھا۔ یہ جنگ تو بموں کے بل بوتے پر ہی لڑی جا رہی ہے۔ سبھی بھیل ہوشیار بندوقچی ثابت ہوئے۔ کچھ لوگ ترقی کرتے کرتے مشین گن تک جا پہنچے تھے اور اب تو انہیں توپ بھی قریب نظر آتی تھی۔ لیکن دھنشیا نے تو سب توپچیوں کو پیچھے چھوڑ دیا اب وہ ہوائی بمباری کے سپنے دیکھا کرتا۔ ہاتھ سے پھینکنے والے بم تو وہ اس ہوشیاری سے پھینکتا کہ فوج کے افسر عش عش کر اٹھتے۔

منگلو چھیڑتا۔ "سردار ہمیشہ سردار رہتا ہے۔"

نیر تھو کہتا۔ "منگلو، تم بھورِیا سانپ ہو اور دھنشیا ایک مور ہے۔ وہ تو جب چاہے تمہیں کھا جائے اور اسے زہر بھی نہیں چڑھ سکتا اور پاس سے دھن سنگھ کہہ اٹھتا۔

جشن " تیرتھو، سردار کی بات یاد نہیں؟ سب بھیل بھائی بھائی ہیں۔ بھوریا اور موری کی تمیز چھوڑ دو۔"

ایک جگہ ایک برمی عورت کی آنکھوں میں ہمدردی کے جذبات دیکھ کر دھنشیا کو اپنی راجلی یاد آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ عورت جنگل سے شہد لائی ہے۔ وہ اس کی زبان سمجھنے سے قاصر تھا لیکن یہ سمجھتے اُسے دیر نہ لگی کہ وہ شہد کا ڈبہ اسی کو دینا چاہتی ہے۔ اس نے شہد لے لیا اور غور سے اس عورت کی طرف دیکھا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی تھی ــــ "سپاہی میں غلام بن چکی تھی۔ تم نے مجھے آزادی دلائی۔" اس نے اپنے دل سے کہا " تو کیا میں اس اکیلی عورت کو آزادی دلانے کے لئے راجلی کو چھوڑ آیا ہوں؟ وہ بھیلن اور یہ برمن۔ نہ جانے اس کا کیا نام ہے؟

دشمن کی خندقوں پر دھنشیا بُری طرح جھپٹتا۔ وہ یوں بم پھینکتا۔ جیسے گوپھیے میں پتھر رکھ کر گھمایا جائے اور پھڑ پھڑ کرتے پرندے گر پڑیں۔ ایک دن وہ دشمن کے نرغے میں بُری طرح گھر گیا تھا۔ مگر وہ دشمن کو مار کر اور بھگا کر زندہ بچ آیا تھا۔

اس رات منگلو نے سب سے پہلے اسے مبارک دی۔ تیرتھ بولا " اب کوئی راجلی کو بتائے کہ تیرا دھنشیا مرتے مرتے بچ گیا تو وہ پھولی نہ سمائے۔"

دھن سکھ نے شرارت سے کہا " اس کی تو سب بھیلنوں کو خوشی ہو۔ میری رکمن تو اس خوشی میں ایسا ناچ رچائے کہ جنگل میں منگل ہو جائے۔" یہاں بھی جنگل تھا۔ لیکن شاید وہ ابھی تک اس سے مانوس نہیں ہو سکے تھے۔ باتوں باتوں میں وہ گھر

کی یاد لے بیٹھتے۔ منگلو اپنی سکھیا کا ذکر چھیڑ دیتا تو تیر کھو کہتا۔ ہو گی سکھیا بھی۔ لیکن میری سندری کی تو اور ہی بات ہے۔ اُس سے اچھا ناچنے والی سارے جنگل میں کہیں نہ ہو گی۔ جس دن میں اسے بیاہ کر لایا تھا۔ اس کی پائل کی جھنکار سن کر ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا۔

دن بھر ٹھس ٹھس ٹھس یا توپوں کی اور بموں کی زلزلاتی، دندناتی آواز اور رات کو عورتوں کی باتیں اور ناچ کا ذکر۔ دھنشیا کو یہ باتیں انمیل معلوم ہوتیں۔ وہ چاہتا۔ کہ انہیں روک دے۔ لیکن پھر سوچتا کہ یہ لوگ یہاں میرا حکم ماننے سے انکار بھی تو کر سکتے ہیں۔ وہ کہہ سکتے ہیں، آج سے تم ہمارے سردار نہیں رہے۔ عورت اور ناچ کا ذکر بند ہوتا تو وہ دھنش بان کی باتیں شروع کر دیتے۔ وہی ارجن کے اگنی بان اور برکھا بان کی باتیں اور وہ چڑ کر کہہ اُٹھتا یہ سب پُرانی باتیں ہیں۔ اور قہقہے بلند ہوتے۔ جیسے انار چھوٹتے ہیں۔

خندق یا کمین گاہ میں بیٹھے بیٹھے دھنشیا سوچتا کہ راجلی دن گنتی ہو گی۔ اس کی آنکھوں کا کاجل ڈھلک کر گالوں پر آ جاتا ہو گا۔ اس کے ذہن میں ایک اداس عورت کا چہرہ اُبھرنے لگتا جو ہمیشہ یہی پوچھتی ــــ کیوں ابھی تک تیرے تیر ختم نہیں ہوئے؟ اور وہ زور سے ہنس دیتا۔ پگلی تجھے کیا معلوم راجلی کہ یہ جنگ تیروں کے بل بوتے پر لڑی جا رہی ہے''۔ پر ہی لڑی جا رہی ہے۔

جنگ ختم ہونے کی خبر سنتے ہی منگلو اور نیر تھو دوڑے دوڑے دھنشیا کے پاس آئے اور بولے "اب ہم اپنے جنگل کو لوٹیں گے۔"

"کیوں یہ جنگل پسند نہیں؟" دھنشیا نے اُن کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اور اگر میں اس جنگل میں رہ جاؤں؟ مجھے تو یہ جنگل اپنے جنگل سے بھی گھنا نظر آتا ہے۔"

دھن سکھ بیٹھا چُرٹ کا کش لگا رہا تھا۔ بولا "اپنے جنگل میں یہ چرٹ کہاں؟"

منگلو دوڑ کر خیمے سے شہد کا ڈبہ نکال لایا۔ دھنشیا نے یہ ڈبہ چھیننے کی ہر چند کوشش کی لیکن ادھر سے دھن سکھ اور نیر تھو نے اسے سنبھال لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈبہ خالی ہو گیا۔ ہار کر دھنشیا نے یہی سوچ لیا کہ اس برمی عورت نے یہ شہد مجھے نہیں نیر تھو، دھن سکھ اور منگلو کو دیا تھا۔ اس نے لاکھ شکر کیا کہ اس برمی عورت کی بات اس نے اپنے ساتھیوں کو نہیں سنائی تھی ورنہ وہ اس وقت اس کا بُری طرح مذاق اڑاتے اور گھر جا کر راجلی سے یہ قصّہ کہتے ہُوئے خوب نمک مرچ لگاتے۔

ایک بھیل ہانپتا ہانپتا آیا اور بولا "جاپان نے ہار مان لی۔ کل روشنی ہو گی اور ناچ ہوں گے بہت بڑا جشن۔ سردار! سنا ہے کہ ناگاساکی اور ہیروشیما پر دو ایٹم بم گرا کر جاپانیوں کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی گئی اور وہ ہار ماننے پر مجبور ہو گئے۔"

"ہاں۔ ہاں جشن۔" دھنشیا نے ہنس ہنس کر کہا۔ "بیٹھ جا اور دم لے لے۔ ذرا پہلے آیا ہوتا تو شہد کا جشن دیکھتا۔ اب تو ڈبہ خالی پڑا ہے۔"

منگلو بولا۔" یہ چاہے نواب بھی اپنا حصّہ لے سکتا ہے۔ ڈبہ توڑ ڈالتے ہیں۔"

"تو گویا یہ شہد کی آخری بوندوں کے ساتھ ٹین کے ٹکڑے بھی کھا جائے؟" تیرتھو نے حیرت سے پوچھا۔

"بھیل کا بیٹا تو ٹین بھی ہضم کر سکتا ہے۔" دھن سکھ نے شہ دی۔" ارے بھائی توڑ دے ڈبہ اور ذرا بجا کر شہد چاٹ لے۔"

اس خوشی میں یہ کسی کو خیال نہ آیا کہ ڈبے کو کہیں آگ پر گرم کر کے شہد کی آخری بوندیں نکالی جا سکتی ہیں۔ دھنشیا کی ذہنی سوئی گھر کی طرف گھوم گئی۔ اُسے یاد تھا کہ پچھلے سال جب اس نے ایک آدم خور شیر کو مار گرایا تھا۔ تو جنگل میں بھیلوں نے دیپ مالا منائی تھی اور ایسے ایسے ناچ ناچے گئے تھے کہ رہتی دنیا تک اس کے ذہن سے نہیں اتر سکتے۔ یہ تیرتھو جو اپنی سندری کے ناچ کی تعریف کیا کرتا ہے۔ سچ ہی تو کہتا ہے۔ اس رات وہی سب پر بازی لے گئی تھی۔

منگلو کہہ رہا تھا۔" کل پونم کی رات ہے اور جب مشعلیں ہی مشعلیں نظر آئیں گی۔ پونم کا چاند بھی شرما جائے گا۔

"پُونم کی رات اور روشنی" تیرتھو کہہ اُٹھا۔" فتح کا جشن ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"دھن سکھ نے پوچھا۔" ناگا ساکی کا کیا مطلب ہوگا بھلا؟"

منگلو بولا۔" وہاں ایک ناگ رہتا ہوگا۔ اسی لیئے اسے ناگا ساکی کہتے ہیں۔"

تیرتھو نے شہ دی۔" ارے واہ رے منگلو بھوریا ——— بھوریا سانپ کا پجاری

ہی ناگ کی بات سوچ سکتا ہے۔"

دھن سکھ نے پھر پوچھا۔" اور ہیروشیما ـــــ اس کا کیا مطلب ہوگا؟"

"ہیروشیما ـــــ ہیروشیما ـــــ سب نے کئی بار یہ نام دہرایا۔ لیکن اس کا کوئی مطلب نہ سوچا جا سکا۔

رات کو سپنوں میں بھی دھنشیا کو ناگاساکی اور ہیروشیما کا دھیان رہا۔ جیسے اس نے اپنی آنکھوں سے وہاں ایک ایک ایٹم بم گرتے دیکھ لیا ہو۔ اور صبح اٹھ کر اس نے دیکھا کہ ہر کوئی فتح کے جشن کا انتظار کر رہا ہے۔

وہ برمی عورت جو اس کے لئے شہد لائی تھی۔ آج پھر ادھر آ نکلی۔ وہ بہت خوش نظر آتی تھی۔ دور سے منگلو نیر تھو اور دھن سکھ بھی وہاں چلے آئے عورت نے دودھ کی مٹکی اٹھا رکھی تھی۔ اشارے سے اس نے سپاہیوں سے اوک لگانے کو کہا اور باری باری وہ تینوں سب دودھ پی گئے اور دھنشیا ان کا منہ دیکھتا رہ گیا عورت بہت شرمندہ نظر آتی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے معلوم ہوتا تو بڑی مٹکی میں دودھ لاتی۔ عورت چلی گئی تو تینوں ساتھی دھنشیا کا مذاق اڑانے لگے۔ آخر اس نے بتا دیا: "ارے اُلوؤ! یہی وہ عورت تھی۔ جو مجھے شہد دے کر گئی تھی۔"

انہی مستیوں میں دن بیت گیا اور جب پونم کا چاند نکلا تو یک لخت سب مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ ناچ کے لئے دور دور سے برمی منگوائے گئے تھے۔ افسر پھولے نہ سماتے تھے۔ سپاہی بھی فتح کے نشہ میں جھوم رہے تھے۔

کئی گھنٹوں تک ناچ ہوتا رہا ابھی جشن اپنے جوبن پر ہی تھا۔ لیکن دھنشیا کی طبیعت بیزار تھی۔ وہ بڑھی عورت کہیں نظر نہ آئی۔ آج وہ اس کے تھرکتے ہوئے قدم دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لبوں سے پھوٹتا ہوا نغمہ سننا چاہتا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ یہاں نہ آتی۔ وہ کہاں رہ گئی؟ وہ ہٹ کر ایک کنارے کھڑا ہو گیا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر اپنے کیمپ کی طرف چل پڑا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ چاندنی رات کے سایوں میں کوئی مہیب شے ہلتی محسوس ہوئی اور اس وقت اسے اپنے ان ساتھیوں کا خیال آیا جو لڑتے لڑتے موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ جیسے اب انکی روحیں اسے پکار پکار کہہ رہی ہوں ـــــ دھنشیا سردار، ہمارے گھر والوں کو ذرا ڈھنگ سے ہماری موت کی خبر سنانا اور تم ان کا خیال رکھنا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس فرض کو بخوشی سرانجام دینے کا وعدہ کر لیتا آج وہ خود بھی اداس تھا۔ جیسے کسی کام کی کمی رہ گئی ہو۔ اور جشن بے مزہ ہو گیا ہو۔

کیمپ کے قریب اُسے آہٹ سنائی دی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ یہ شیر ہے جیسے بُو سونگھ کر اس نے پتہ چلا لیا کہ یہ آدم خود شیر ہے۔ یہ بھی جاپانیوں کی طرح انسان اور انسانیت کا دشمن ہے۔

جیسے کہیں سے اس بڑھی عورت کی آواز آئی ـــ جانے سے پہلے ہمارے اس آدم خور دشمن کو بھی مارتے جاؤ، سپاہی!

وہ اندر سے ایک بم اٹھا لایا۔ وہ دبک کر کھڑا ہو گیا۔ .. چاپ برابر سنائی

دے رہی تھی۔ آواز کا حساب لگا کر اس نے بم پھینکا۔ لیکن بم نہ پھٹا۔

وہ لپک کر بندوق اٹھا لایا۔ آواز کی سیدھ رکھ کر اس نے گولی چلانی چاہی بندوق بھی انکار کر رہی تھی۔ لو اس کا بھی کوئی کل پرزہ پھنس گیا۔ اور اب یہ حرکت نہیں کرے گا۔

اسے اپنے اوپر بہت غصّہ آیا تو کیا یہ آدم خور شیر آج بچ کر نکل جائے گا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اچانک اُسے اپنے دھنش کا دھیان آیا۔ اور وہ دوڑ کر اسے نکال لیا۔

وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے راجلی کا چہرہ پاس کی جھاڑی سے ابھرتا ہوا نظر آیا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ اب سوچتے کیا ہو، مارو تیر۔ ہتھیار وہی جو وقت پر کام آئے۔

اس نے دھنش تان کر شیر کے قدموں کی چاپ کا حساب لگایا۔ اور تیر چھوڑ دیا۔ شیر چنگھاڑا۔ تیر نشانہ پر لگا تھا۔ اس نے ایک اور تیر چھوڑا اور چنگھاڑ کے پیچھے پیچھے شیر کے قریب جا پہنچا۔ شیر دم توڑ چکا تھا۔

اس نے سوچا آج میں نے انسان کی تمام نسلوں کی طرف سے تمام خونی درندوں سے انتقام لے لیا اور شیر کو گھسیٹتے ہوئے جشن میں افسروں کے پاس لے گیا۔ اسے ناگاساکی اور ہیروشیما پر برسائے گا دو بموں کا خیال آیا اور پھر اس کا دماغ ان دو نیروں کی طرف گھوم گیا جو اس آدم خور پر چلائے گئے تھے۔ اس نے سوچا میں نے فتح پائی ہے۔ یہ جشن میرے ہی استقبال میں کیا جا رہا ہے۔

یکدم ناچ چھوڑ کر لوگ شیر کی لاش کی طرف لپکے۔ دھنشیا کی شیر کی لاش کی طرف کبھی اپنے افسروں کی طرف کبھی برمیوں کی طرف اور کبھی اپنے ساتھی بھیلوں کی طرف اُٹھ جاتیں۔ آخر میں اس کی نگاہیں اپنے دھنش بان پر جم گئیں۔ وہ بولا: میں نے شیر پر بم پھینکا۔ لیکن وہ نہ پھٹا۔ بندوق چلانی چاہی، وہ بھی نہ چلی۔ آخر یہ میرا دھنش بان ہی میرے کام آیا۔۔۔۔"

پُرانے محل

ڈھولوں اور شہنائیوں کی سلامی میں وہ گاڑی سے اُترا۔ اُسے بالکل امید نہ تھی کہ گاؤں کا گاؤں یوں اُس کے استقبال کو اسٹیشن تک کھنچا چلا آئے گا۔ باپ نے لپک کر اُس کے گلے میں گیندے کے پھولوں کا ہار پہنایا اور وہ جھٹ باپ کے قدموں پر جھک گیا ڈھولئے زور زور سے ہاتھ چلانے لگے۔ شہنائیوں کے سُر بھی تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ ہجوم نے نعرہ لگایا ـــــ جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔ جگمگاتی مسکراہٹوں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ بڑی مشکل سے خوشی کے آنسو روک سکا۔ عورتوں کی طرف جھک کر اُس نے ماں کے چرن چھوئے، چچی کو پرنام کیا، بہنوں کی مسکراہٹ کا جواب دیا، سکھیوں کے بیچ میں بنی سنوری اپنی بیوی کی طرف غرور سے دیکھا اور اپنے پانچ سالہ بیٹے پُورن کو اُٹھا کر

گلے سے لگا لیا۔

وہ چاہتا تھا ہر کسی سے بار بار پوچھے، کہو گاؤں کا کیا حال ہے اور ہنس ہنس کر کہے کہ آج مَیں واپس آ گیا ہوں — مَیں، جھنڈا سنگھ حوالدار۔ گاؤں کی یاد ہمیشہ میرے خون کو گرماتی رہی ہے پرتاپے اور سوہنے کی وہ خوبصورت خوش گپیاں اور اُن کا وہ ہاں میں ہاں ملانے کا انداز بھلا مجھے کب بھول سکتا تھا؟ ڈھولوں اور شہنائیوں کے سُر اُسے اپنے بیاہ کی یاد دلا رہے تھے۔ بیاہ ہوا، دلہن گھر آئی اور جونہی اُس نے بیٹا جنا، وہ کسان سے سپاہی بن کر لام پر چلا گیا اب پھر وہی کسان کا کسان۔ اب وہ بیوی کا دکھ سکھ پوچھے گا۔ محاذ کی وحشت انگیزی سے اُس کے دل ودماغ یکسر بے نیاز ہو گئے۔ اب وہ گاؤں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔

بھنگیوں، چماروں اور میراثیوں کا جھرمٹ جنگلے کے اُس پار پیسوں پر جھپٹا مارنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ مفت پیسے ہاتھ آنے کے لالچ میں جاٹوں کے چھوکرے بھی جنگلے کے اُس پار چلے گئے۔ اور جونہی اُس کے باپ نے لال گتھلی میں ہاتھ ڈال ڈال کر چونیوں دونیوں اور پیسوں کی مٹھیاں بھر بھر کر اپنے بیٹے پر نچھاور کرنا شروع کیں، وہ ایک دوسرے سے اُلجھتے چلے گئے۔ دھکا پیل سے گزر کر مار پیٹ کی نوبت آ گئی۔ وہ چاہتا تھا، باپ کا ہاتھ روک لے لیکن وہ خاموش کھڑا رہا۔ باپ کی خوشی میں خلل ڈالنا اُسے کسی طرح منظور نہ تھا

یہی تو خوشی کا دن ہے — کوئی کہہ اُٹھا، سرپنچ سنگھ آج تو چاندی کے روپے بھی برسائے جا سکتے ہیں۔ اور یہ سن کر سرپنچ سنگھ تیزی سے چھٹا پیسے پھینکنے لگا پھر باہیں —

کوئی بولا — ایک گتھلی سے کیا ہوتا ہے؟

ارے اب چُپ بھی رہ امن سنگھ ــــ سرپنچ سنگھ نے تیزی سے مٹھی پھینکتے ہوئے کہا، پُورے سَو کا چُھٹا لایا ہوں۔

ہجوم کی بے ربط آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اُس کے لنگوٹیے یار اُسکے لباسوں کو چھُو چھُو کر دیکھتے ہوئے اُچھل اُچھل کر ہنس رہے تھے، جیسے کہنا چاہتے ہوں حوالدار صاحب، جنگ میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ گھر کی یاد آتے ہی بیوی سے ملنے کو جی تڑپتا ہوگا ہماری یاد کب آتی ہوگی؟ وہاں تو تمہیں ماہیا کے ٹپّے بھی یاد نہ رہے ہونگے جن میں بالو کا حُسن یہاں تمہارے خون میں نشہ سا پیدا کر دیتا تھا۔ جواب میں وہ بھی ہنستا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی خوشیاں جھلک رہی تھیں۔ وہ امن سنگھ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کہو چچا تم کیسے گھر سے خالی ہاتھ چلے آئے۔ آخر چچا کا بھی کچھ فرض ہوتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اگر امن سنگھ نے پوچھ لیا کہ پہلے اتنا تو بتاؤ کہ میرے لئے بھتیجا کیا لایا ہے تو اُسے خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑیگا، اُس نے پھر اپنے ہم عمر جوانوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

وہ اپنے کھیت دیکھنے کے لئے بیتاب ہو اُٹھا۔ دُور تک پھیلے ہوئے کھیت۔ ان سے گزر کر ہی تو گاؤں آئے گا۔ اپنا گاؤں۔ اِن پانچ سالوں میں تو شاید گاؤں اتنا بدل گیا ہوگا کہ میں مشکل سے پہچان سکونگا۔ اور اپنا گھر۔ اُس کی دیواریں تو جھٹ مجھے پہچان لیں گی۔ میں اُن سے لپٹ لپٹ کر کہونگا کہ آج ارجن سنگھ حوالدار واپس آ گیا۔ اب وہ تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائیگا۔ اور اُس ضرب المثل کا خیال آتے ہی کہ جب بیٹا پیدا ہوتا ہے، گھر کی دیواریں کانپ اُٹھتی ہیں اور سوچتی ہیں، کون جانے برخوردار ہمیں ڈھائے گا یا قائم رکھے گا، اُس نے غرور سے

سر اونچا کر لیا میرے ہاتھوں یہ دیواریں اور بھی اُبھریں گی۔

ہجوم جلوس میں منتقل ہونے لگا۔ سب سے آگے ڈھول لئے اور شہنائی والے تھے۔ اُن کے پیچھے بوڑھے، پھر جوان گبھرو، پھر چھکڑے پر سوار عورتیں اور سب سے پیچھے بھنگی چمار اور میراثی تھے۔

وہ جوان گبھروؤں میں پرتاپے کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ رہ رہ کر اُس کی نگاہیں پیچھے اپنی بیوی کی طرف اُٹھ رہی تھیں جو چھکڑے کے اگلے حصّے میں پیلا دوپٹہ اوڑھے بیٹھی تھی ٹھیک اُسی طرح اس کے دماغ کے سبزہ زاروں میں بھی پیلے دوپٹے والی اُس کی بیوی مسکراتی رہی تھی۔ کسی بھی جگہ رانو نے اُس کے ذہن سے اپنی چھاپ اُترنے نہ دی تھی۔ جب کبھی وہ کسی عورت کی طرف راغب ہوتا، رانو گویا اُس کا ہاتھ تھام کر کہتی، تمہاری یہ حرکتیں مجھے ناپسند ہیں۔ اور آج تو وہ اپنی مجبوریوں اور بے بسیوں سے بے نیاز تھا۔ آج وہ پہلے دوپٹے والی پر انو سے دل کھول کر باتیں کرے گا اور وہ خود دیکھ لے گی کہ اُس کا راجہ کس طرح مسکرا رہا ہے۔

محاذ پر اُس نے اپنے افسروں کو ہمیشہ یہ کہتے سنا تھا کہ جنگ کے بعد دنیا بدل جائے گی اب تو جنگ ختم ہو چکی تھی۔ چلتے چلتے اُس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کی طرف اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ اتنی دور سے گاؤں نظر نہ آتا تھا۔ گاؤں کے دوسرے کنارے اُس کا گھر تھا۔ محاذ پر جب کوئی وطن کا ذکر کرتا تو یہی گھر اُس کی نظروں میں پھر جاتا وہ اس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتا۔ اُس کے ساتھی کہہ اُٹھتے، واہگورو نے سب

تو ایک سو گھماؤں کا مالک نہیں بنایا۔ صحن میں سیمنٹ کا فرش، چارپائیوں کی بجائے پلنگ، عورتوں کی بانہیں سونے میں پیلی۔ گھی کے دیئے۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ میں بھی کیسے کیسے جھوٹ سچ بولتا رہا ہوں، لیکن اگلے ہی لمحے اُس کا غصہ غرور میں تبدیل ہو گیا۔ ہاں، جنگ کے بعد دنیا بدل جائے گی۔ سچ مچ سیمنٹ ہی کے فرش ہوں گے، پلنگ، سونا چاندی، گھی کے دیئے ——— او ہو! اب تو بجلی کی بتیاں جگمگائیں گی۔

بے ربط آوازوں کو چیرتی ہوئی اُس کے باپ کی آواز سنائی دے رہی تھی ——— گیانو اور نہالو کے بیاہ ہم نے اس ٹھاٹھ سے کیئے کہ سارا گاؤں دیکھتا رہ گیا۔ جھنڈا یہاں ہوتا تو اور بھی ٹھاٹھ جم جاتا۔ جنگ کے دنوں میں اتنا سونا کس نے دیا ہو گا؟

بیٹی تو گائے کی ذات ہے ——— کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے کوئی بوڑھا کہہ اُٹھا بیٹی کو جتنا سونا پہناؤ کم ہے۔

بیٹی کو جتنا سونا پہناؤ کم ہے، یہ بول تیر کی نوک کی طرح اُس کی روح میں کھب گیا۔ اگر باپ کی خوشی پیشِ نظر نہ ہوتی تو وہ اُس بوڑھے کھوسٹ کی زبان نوچ لیتا۔ کیا بیٹے کمانے ہی کے لیئے ہوتے ہیں؟

ڈھولوں اور شہنائیوں کا ہنگامہ تیز سے تیز تر ہو گیا۔ اُس نے سوچا، یہ کہاں کا راگ ہے نہ سُر نہ تال۔ یونہی زور لگا رہے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ لپک کر ان اناڑیوں کے ہاتھوں سے ڈھول اور شہنائیاں چھین کر پھینک دے اور کہے پیٹ ہی بھرنا ہے تو کوئی اور روزگار ڈھونڈو یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ کہاں ملٹری بینڈ اور کہاں تمہارا یہ بے معنی شور، نہ تناسب نہ آہنگ۔

یہی کھیت تھے جن سے اُس کا بچپن وابستہ تھا۔ بچپن اور شباب۔ اسی راستے پر کسی بالو کی یاد میں بار ہا اُس نے ماہیئے کے ٹپّے گائے تھے۔ اپنے فوجی لباس کا جائزہ لیتے ہوئے اُسے اس دھول سے اَٹے ہوئے راستے پر غُصّہ آنے لگا۔ جانے یہاں سڑک کب بنے گی؟ یہ لوگ سڑک کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟

اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آفتاب سر پر آ چکا تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے آفتاب سے دُور تھے نیلگوں آسمان پر سفید بادل کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، اُس نے سوچا، اُوپر یہ بادل، نیچے یہ دھول سے اَٹا ہوا راستہ اور لمبے چوڑے کھیت۔ اس گاؤں کے بوڑھے اور جوان یکساں طور پر ان بادلوں سے مانوس نظر آ رہے ہیں۔ جنگ ہو یا امن، نیلگوں آسمان پر سفید بادل ہمیشہ خوبصورت معلوم ہونگے۔ لیکن ان پانچ سالوں میں آسمان کی طرف دیکھنے سے تو چاروں طرف محض ہوائی جہاز ہی نظر آیا کرتے تھے۔ پیچھے مڑ کر اُس نے اپنے ایک لنگوٹیئے یار سے کہا۔۔۔ منگل سنگھ، تم تو ہر روز ان بادلوں کی خوبصورتی دیکھتے ہو گے۔

ہی ہی ہی۔۔۔ ہنسی کا فوّارہ سا پھوٹ پڑا۔ نوجوانوں کا خیال تھا کہ جھنڈا کچھ سوچ رہا ہے اور جب بھی بولے گا کوئی ایسی بجھارت ڈالے گا کہ سر پٹکنے پر بھی کوئی جواب نہ سوجھ سکے گا یہ سوال کرتے ہوئے اُس نے سوچا تھا کہ اُس کے دوست اُسے تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگ جائیں گے کہ واہ واہ وہ پہلا زمانہ اُسے بھُولا نہیں۔ لیکن جب سب جوان اُس کی ہنسی اُڑانے لگے وہ کھسیانا سا ہو کر سامنے بڑے بوڑھوں کی ٹولی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اُس کا باپ کہہ رہا تھا۔۔۔ روپیہ اس لئے نہیں ہوتا کہ اندر دبا کر رکھا جائے۔ اس

مقدمے پر ہم نے دو بیاہوں سے زیادہ رقم خرچ کر ڈالی۔ جھنڈا یہاں ہوتا تو ہمارا رعب اور بھی جم جاتا۔

ہاں ہاں ـــــ کوئی کہہ اٹھا، اجھنڈا تو جھنڈا ہی ہے۔

جھنڈا! ـــــ وہ بڑبڑایا جھنڈے کا روپیہ مقدموں اور بیاہوں میں بے دریغی سے لٹا دیا۔ جھنڈا یہاں ہوتا تو ہرگز ایسا نہ کرنے دیتا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو جو اُس کے باپ کی ہاں میں ہاں ملائے چلے جا رہے تھے سمجھائے کہ خون پسینے یا زندگی اور موت کی کمائی کو خواہ مخواہ خون خرابے پر لٹا دینا کیا عقلمندی ہے۔ کھیمے اور تنے، پر بھی اُسے کچھ کم غصہ نہ آیا۔ اُسے معلوم تھا کہ دیر سے اُن کی عداوت چلی آتی ہے۔ اب سارے جیل میں پڑے سڑ رہے ہونگے۔ خواہ مخواہ ہمارے سامنے آئے"

بادلوں نے آفتاب کو ڈھک لیا تھا اور اُن کے کناروں پر کرنیں زری کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ معاً پرتاپا کہہ اُٹھا ـــــ

ونجلی دی واج سُن کے

رُکّا امبر چھڈ دے نہ مائیاں!

اُس نے تیزی سے اِدھر اُدھر گردن گھمائی۔ کہاں ہے وہ بنسری جس کی آواز سُن کر خشک آسمان نمناک ہوا جاتا ہے؟..... وہ دیر تک پیچھے کی جانب دیکھتا رہا۔ عورتوں کا جھکڑا دور تھا۔ راتو کا پیلا دوپٹہ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اُسے دیکھے بغیر اُس نے یہ پانچ سال کس طرح گزار دیئے تھے، یہ سوچ کر اُسے خود بہت حیرت ہوئی۔ چھکڑے کے

ساتھ ساتھ دھول کا ایک بے پناہ بادل اُڑ رہا تھا۔ اُس کا ذہن فرانس اور اٹلی کی سڑکوں کی طرف گھوم گیا۔ کہیں دھول کا نام نہیں۔ گو بموں سے بہت سی سڑکیں تباہ ہوگئیں لیکن کچھ تو بنائی گئی ہوں گی اور کچھ بن جائیں گی۔ لیکن یہاں تو یہی دھول اڑتی رہے گی۔

ایک نوجوان کہہ رہا تھا "میں بھی لاٹو کی طرح کہیں سے کوئی شنگارو بھگا لاؤنگا۔"

"لیکن تم تو باپ کے اکلوتے بیٹے ہو" منگل سنگھ بولا "لاٹو کی تننگارو، ماگھی اور کرتار کی لاڈلی بھابی ہے۔"

"صرف بھابی ہی یا کچھ اور بھی؟" کسی نے کہا "جب بیاہ کی صورت نظر نہ آئے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

اُسے معلوم تھا کہ معمولی سی پردہ داری کے ساتھ بیچاری بھابی کو دو دو تین تین بھائیوں کی بیوی بننے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ لیکن کیا ہمیشہ یونہی ہوتا رہے گا؟ دوسرے ملکوں کو تو یہ لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہاں نہ لڑکیاں کم پیدا ہوتی ہیں نہ لڑکے اُنہیں زبردستی بھگانے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ وہ کبھی بیچی ہی جاتی ہیں۔ سب ملکوں کو چاہیئے کہ مل کر ہندوستان ہی کو بدل ڈالیں۔

جلوس ایک پرانے کھنڈر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ڈھول چلّاتے رہے۔ شہنائیاں عجیب سی راگنی سے الجھ گئیں۔ جیسے اسی کھنڈر کی کسی روایت کو زندہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہو۔ لیکن اس کھنڈر کی اینٹیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی تھیں۔

عورتوں کا چھکڑا رینگتا چلا آ رہا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ یہ عورتیں کبھی مردوں سے کندھا ملا کر نہیں چل سکتیں۔ یہ عورتیں، یہ چھکڑا، دونوں رینگ رہے ہیں۔ یہاں تو وقت بھی ایک

سُست چھکڑے کی طرح رینگتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے پہیئے صرف دھول کے بادل ہی اڑا سکتے ہیں۔ اونہہ اس کی رفتار نہیں بدل سکتی۔

"ارے دلی اشنگارو تو ایک مست ہرنی ہے"۔۔۔ ایک جوان نے تہبند کو اونچا کرتے ہوتے کہا، لالو نے کمال کیا کہ اُسے پکڑ لایا۔

پاس سے لالو جھٹ کہہ اُٹھا۔" اور دلی جانتا ہے کہ اپنے دیور سے وہ یہی کہے گی پہلے گندے جوہڑ میں منہ دھو آؤ۔"

اُسے گھِن آنے لگی۔ یہ بھولے بھٹکے جوان اپنے ضمیر سے مجبور رہیں۔ گندا جوہڑ ہی اُن کے ذہن پر سدا سے سوار ہے۔ اس کے باہر شاید وہ جا ہی نہیں سکتے۔ فضا میں گاؤں کے گوردوارے کا زنگ خوردہ کلس اُبھرنے لگا، اُس نے سوچا کہ گوردوارے کا گرنتھی ہر روز سنکھ پُورتا ہوگا۔ کہتے ہیں سنکھ کی آواز گوروؤں کو بہت پسند تھی۔ دس گوروؤں، پانچ پیاروں اور چار صاحبزادوں کا محبوب سنکھ۔ چالیس مکتوں، شہیدوں، مریدوں اور صدق رکھنے والے سکھوں کا پیارا سنکھ۔ جیسے دُور سے گاؤں کے گوردوارے کا سنکھ گونج اُٹھا ہو۔ بچپن ہی سے اُسے گوردوارے جانے کی عادت ڈالی گئی تھی۔ دھرم کے لئے جانیں قربان کرنے والوں کی کہانیاں اُس کے ضمیر کا حصّہ بن چکی تھیں۔ اُس کے ذہن میں چرکھڑیوں پر چڑھتے ہوئے لوگ اُبھرنے لگے۔ بدن کا جوڑ جوڑ جدا کرانیوالے لوگ۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کی کھالیں کھینچ لی گئی تھیں۔ کچھ وہ شہید تھے جنھوں نے کھوپڑیاں اُتروائی تھیں لیکن دھرم نہیں چھوڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ گورو صاحب کا شبد گنگنانے لگا۔

——اپنی مار پیٹ گھر لانے میں کی درد نہ آیا —— اُسے یقین تھا کہ سچے پادشاہ نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو جنگی مصیبتوں میں یکساں طور پر گرفتار دیکھ کر کہا تھا کہ ہے واہگورو، لوگوں پر اتنی مار پڑی کہ وہ چیخ و پکار کرنے لگے۔ کیا تجھے اُس وقت ذرا درد محسوس نہ ہوا؟ پھر وہ اِس سوچ میں کھو گیا کہ اِس جنگ میں جو تباہی ہوئی ہے۔ اُس کا تو کچھ اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ بہتوں کو تو اُس نے خود بھی موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ سچے پادشاہ سے تو کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔ اب تو جنگ ختم ہو چکی ہے۔ گوردوارے کا زنگ آلود کلس بدلنے کا وقت آپہنچا ہے اُسے یوں محسوس ہوا کہ ننھی بھی سنگھ کی زبانِ حال سے پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے۔ بہت کچھ بدلنا ہوگا۔ اکیلا کلس ہی کیوں ؟

امن سنگھ کہہ رہا تھا۔ "ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔ ہم ہمیشہ غریب رہیں گے چاہے کوئی بھی بادشاہ کیوں نہ آجائے، چاہے بڑی سے بڑی جنگ بھی کیوں نہ لڑی جائے"

"لوگوں نے سچے پادشاہ کی سیوا سے منہ موڑ لیا ہے"—— کسی نے شطرنج کا مہرہ بدلنے کے انداز میں کہا۔ لوگ خود غرض ہو گئے۔ اسی لئے بار بار جنگ لڑی جاتی ہے۔

"بالکل"—— امن سنگھ نے پھر سے باگ سنبھالتے ہوئے کہا، پورے لاکھ روپے کی بات سُن لو، سر پنچ سنگھ۔ ہماری حالت اُس سکھ جیسی ہے جو گورو ہرگوبند رائے جی کو شہد دینے جا رہا تھا"

سرپنچ سنگھ کہہ اُٹھا: "یہ قصہ بہت پرانا ہے۔ لیکن ہم آج تک سچے پادشاہ کو سچے دل

سے شہد دینے والے سکھ نہیں بن سکے۔"

بڑے بوڑھوں کی باتوں کا جوان گبھرووں پر یہ اثر ہوا کہ وہ شہد کے متعلق باتیں کرنے لگ پڑے۔

وہ ان بے ربط باتوں سے تنگ آچکا تھا۔ پھر اُس کا ذہن ڈھولوں اور شہنائیوں کے بے ہنگم شور میں اُلجھ گیا۔ بادل پرے ہٹ گئے تھے اور آفتاب ہلکی ہلکی آگ برسا رہا تھا۔ عورتوں کا چھکڑا پیچھے رہ گیا تھا۔ نوجوانوں میں مبہم سی کانا پھوسی ہونے لگی۔ اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر کسی نے سُر چھیڑا:

منڈا تیرا تے تُہاندرا میرا

نی ڈنڈی ڈنڈی جان والیئے!

جھٹ کسی نے مقابلے کی چوٹ کی:۔

مُنڈا جموں گا دہیں دے پھُٹ ورگا

نی کچا دُودھ پین والیئے!

ایسے بیسیوں نغمے اُس کے ذہن کی محرابوں سے ٹکرائے۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا عورتوں کا چھکڑا رینگتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یہ سب مائیں تھیں یا بہت جلد ماں بننے والیاں۔ اُس نے اُس جوان کی طرف گھور کر دیکھا جس نے اس مطلب کا نغمہ الاپا تھا کہ اے پگڈنڈی کے کنارے کنارے جانے والی، تیرا بیٹا تو مجھ سے مشابہت رکھتا ہے۔ بشریر۔ اور وہ جس نے تازہ دودھ پینے والی کو یقین دلایا تھا کہ وہ خوبصورت بیٹا جنے گی ـــ وہی کے

لونڈے جیسا۔ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو، میں اپنی رانو کو تازہ دودھ پلایا کروں گا۔

"آگ لگنے پر دھواں تو نکلے گا"۔۔۔ ایک جوان کہہ رہا تھا، "عقل والے سچ کہتے ہیں عشق چھپ نہیں سکتا۔"

"ڈاچی کی مہار پاؤں میں اٹک جائے تو وہ کیا کر سکتی ہے؟" کسی نے عقل بگھاری، "واہگورو کی کرپا رہے تو تقدیر بھی دھوکا نہیں دے سکتی۔"

"زمانہ بدل گیا"۔۔۔ کسی نے کہا، "لوگ اب واہگورو سے نہیں ڈرتے۔"

اُسے محاذ پر سُنا ہوا بول یاد آ گیا۔۔۔ جنگ کے بعد دنیا بدل جائے گی۔ وہ اِن لوگوں سے پوچھنا چاہتا تھا، تم کب بدلو گے۔ کب تک یہ ڈھول لئے اور شہنائی والے بے ربط شور بلند کرتے رہیں گے؟ کب تک یہ موٹے اور بھدّے بیلوں والا چھکڑا دھول کے بادل اُڑاتا رہے گا؟

جلوس ایک پُرانے کنوئیں کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ پیاس کے مارے پانی پینے لگے۔ بھاری بھرکم رہٹ اپنی بے ڈھب سی لکڑی کی چرکھڑیوں پر شرمندہ سا نظر آتا تھا۔ کنوئیں سے پانی لانے والی مٹی کی ٹنڈیں کہیں کہیں سے ٹوٹ چکی تھیں۔ گادی پر بیٹھا ہوا لڑکا بے رحمی سے بوڑھے بیل کو شیشم کی ٹہنی سے مار رہا تھا۔ رہٹ کی روں روں ایک احتجاجی چیخ معلوم ہوتی تھی۔ پانی پیتے ہوئے اُس نے سوچا، بوڑھا کنواں رونے پر مجبور ہے۔ شاید وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں صدیوں سے یونہی رو رہا ہوں۔ میں اُس

زندگی سے اُوب گیا ہوں۔ اُسے اس احساس سے دکھ سا ہونے لگا۔ صدیوں کے یہ بندِ بھلا تھوڑے سے عرصے میں کیونکر ٹوٹ سکتے ہیں؟ یقیناً یہ سب ہوائی قلعے ہیں۔ کہ جنگ کے فوراً بعد ہی دنیا بدل جائے گی۔

سرپنچ سنگھ کہہ رہا تھا — "روپیہ آتا ہے پیچھے اور جانے کا راستہ پہلے ہی نکل آتا ہے۔"

اُس کے جی میں آیا کہ باپ سے بحث چھیڑ دے اور ثابت کر دکھائے کہ تم نے ایک بہت اچھا موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ کیا یہ ضروری تھا کہ گیانو اور نہالو کے بیاہ پر سونے کی نمائش کی جاتی، ریشم ہی ریشم خریدا جاتا؟ کھیمے اور رتنے کو جیل میں بھجوانے کی خاطر دولت لٹانا بھی کہاں ضروری تھا؟ روپیہ بچا کر رکھا ہوتا تو آج ہم زمین کی قسمت بدل سکتے تھے۔ اور تم نے اپنے پوتے کا تو کچھ دھیان ہی نہیں کیا۔ بڑا ہو کر وہ کیا کہے گا کہ اُس کا باپ تمام عمر بھاڑ جھونکتا رہا ہے۔ وہی بنجر سی زمین جو پشت در پشت چلی آ رہی ہے۔ اُسے بدلنے کے لئے تو روپے کی ضرورت تھی۔ روپے کی مدد ہی سے تو زندگی کو بدلا جا سکتا ہے۔ اور آنے والی نسلیں بڑے فخر سے بزرگوں کی یاد کر سکتی ہیں۔ لیکن اب تو وہ اسی اندھیارے میں بوجھ ڈھوتی رہیں گی۔

پرتاپے نے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "کیوں جھنڈے ولایت میں بھی ایسی ہی زمین ہوتی ہے؟ اسی طرح گیہوں اُگتا ہے اور کپاس پیدا ہوتی ہے؟"

اُس نے دیکھا کہ کم از کم ایک شخص تو ایسا بھی موجود ہے جو نئی دنیا کی باتیں سننے

کے لئے بیتاب ہو رہا ہے۔ وہ ضرور میری مدد کرے گا۔ اُس نے مسکرا کر کہا: "اُن کے طریقے تم دیکھو تو حیران رہ جاؤ۔ وہ تو زمین سے سونا اُگا تے ہیں۔"

"تو تو وہ طریقے ضرور سیکھ آیا ہو گا۔"

"کیوں نہیں؟ وہاں تو سب کچھ نیا ہے اور یہاں سب کچھ پُرانا۔ وہاں تو سال میں کئی کئی فصلیں اُگاتے ہیں اور انہیں بیلوں کے ساتھ بیل نہیں بننا پڑتا۔"

سرپنچ اسنگھ نے پلٹ کر کہا: "بیلوں سے کیوں نفرت ہے؟ یہ تو گئو کے جائے ہیں۔ انہی کے پرتاپ سے ہمارے بھنڈار بھرے رہتے ہیں۔"

وہ بولا: "تم نے اُن کے بھنڈار نہیں دیکھے، باپو۔"

اُسے کسی بھی صورت منظور نہ تھا کہ رنگ میں بھنگ ڈالے۔ اپنی بیوی کے پاس جا کر اُس نے پُورن کو گود میں لے لیا اور یوں سر پہ سے اُچھال اُچھال کر اُس سے کھیلنے لگا جیسے وہ یہ کہنا چاہتا ہو کہ اگر میں اپنے باپ کو نہیں سمجھا سکتا تو کیا ہوا، بیٹے کو تو سمجھا لوں گا۔

سُورج ایک طرف کو لڑھک گیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ گوردوارے کے کلس کی طرح زندگی زنگ خوردہ ہو چکی ہے۔ وہ پکار کر کہنا چاہتا تھا کہ یہ زنگ اُتر بھی سکتا ہے۔ محاذ سے چلتے وقت اُس نے تہیہ کیا تھا کہ گاؤں کی زندگی کو نیا راستہ دکھاؤں گا۔ لیکن قدیم ماحول کی پتھریلی دیوار سے ٹکر لینا آسان نہ تھا۔ یہاں تو وقت کی رفتار بدلنے کے لئے میری بیوی بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دے اور یہ بٹیا اور آنیوالے

بیٹے ــــ جب کچھ ہو سکتا ہے۔

ڈھولئے ڈھول سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ شہنائی والے بھی کوئی نیا سُر چھیڑنا چاہتے تھے۔ لوگ پھر جلوس میں منتقل ہونے لگے۔

اُس نے پرتاپے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "وہاں مشینی ہل چلتے ہیں۔"

"مشینی ہل!" پرتاپے نے حیرت سے پوچھا۔

وہ اُڑ کر اپنے کھیتوں میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ آج پورے پانچ سال بعد وہ انہیں دیکھے گا۔ . . . . . اُن کی مٹی کو چھوئے گا۔ آج وہ اس مٹی سے پوچھے گا کہ اُس کی غیر حاضری میں وہ بہت اُداس تو نہیں ہو گئی تھی۔

جلوس پھر اپنے راستے پر چل پڑا۔ کچھ فاصلے پر بوڑھا جنگ سنگھ اُن کے کھیت میں ہل چلا رہا تھا۔ جلوس کو دیکھ کر اُس نے ہل چھوڑ دیا اور جھنڈے سے ملنے کے لئے راستے کی طرف آنے لگا۔

یکایک جھنڈے کے ذہن میں یہ خیال اُبھرا کہ وہ خود آگے بڑھ کر بابا کے چرن چھوئے اور ہل کو بھی چھو کر دیکھے۔

بابا سے مل کر وہ ہل کی طرف بڑھا۔ پرتاپے نے ہنس کر کہا: "اب تو ہر روز ہی ہل چلایا کرو!"

لوگ قہقہے مار مار کر ہنسنے لگے اور اُس کے پیچھے پیچھے کھیت میں پہنچ گئے۔ مُنہ سے وہی پُرانی تت تت کی آواز نکال کر وہ ہل چلا رہا تھا۔ جنگ سنگھ بُت بنا کھڑا رہا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ میں سٹیشن پر نہیں آ سکا۔ لیکن تمہارا ہل چلانے کا شوق

لام پر پانچ سال گذارنے کے بعد بھی قائم رہا، یہ دیکھ کر میں بہت خوش ہوں۔

امن سنگھ نے سرپنچ سنگھ کو چھیڑا: "تمہارا جھنڈا لام پر جا کر بھی ذرا نہیں بدلا"

تین چار چکر لگانے کے بعد بھی جھنڈے نے ہل نہ چھوڑا۔ سب حیران تھے۔ کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گیا۔

پرتاپے اور امن سنگھ نے اُسے پکڑ کر ہل سے الگ کیا۔ سرپنچ سنگھ اُس کے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر پسینہ پونچھنے لگا۔

ایک بار پھر ڈھولوں اور شہنائی والوں نے اپنا راگ چھیڑ دیا۔ جونہی جلوس کھیت سے نکلنے لگا۔ لوگوں کی نگاہیں جھنڈے کے پانچ سالہ بیٹے پورن کی طرف اُٹھ گئیں۔ جو اُس وقت ہل کے پھالے سے مٹی کرید رہا تھا۔

ڈھولوں اور شہنائیوں کا شور یکدم اُبھر آیا جیسے اُس ننھے کسان اور پرانے ہل کو سلامی دی جا رہی ہو۔

جُگنو ہی جُگنو

"وقت اُڑا جاتا ہے، نرگس!" مہتہ کہہ رہا تھا اور نرگس کی مسکراہٹ وقت اور مقام کی روک تھام سے بے نیاز تھی۔ لیکن اس کا بھی کیا ثبوت؟ مہتہ نے اپنی بات پھر دوہرائی: "وقت اُڑا جاتا ہے نرگس، عمر خیام سچ کہتا ہے......"

کوہستانوں اور جنگلوں سے دُور، اس بالاخانہ پہ بیٹھے بیٹھے میں نے اپنے ذہن میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں مجھے کتنے ہی دیئے نظر آئے، کچھ ٹمٹما رہے تھے، کچھ بجھ چکے تھے اور ان بجھے ہوئے دیوں کو پھر جلا سکنے کی ہمت مجھ میں باقی نہ تھی کئی کنوارے عشق کئی کنوارے حُسن گہرے گہرے سایوں کے نیچے دبے پڑے تھے اور سنتھال دلہن کا بنتی رت کا گیت دل کو چھیڑ چھیڑ جاتا تھا: "پلاس کے لال لال پھول تو اب کھلنے بھی لگے، مہر کنوار ہی کے

جوڑے پر پلاس کے پھول نظر آتے ہیں۔ بالم مجھے بھی وہ لال لال پھول لادو نا، نہیں تو میں جوڑا نہ باندھوں گی۔ پہاڑ کی چوٹی تک چلی گئی۔ وہ پگڈنڈی تو کبھی کی لال لال ہو اٹھی۔ میلے کو جانے والی ہر لڑکی گائے گی اور ناچے گی تم مجھے بھی وہ لال لال پھول لادو نا نہیں تو میں جوڑا نہیں باندھونگی"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہاں اس بالاخانہ پر نرگس مسکرا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے پیشِ نظر سنتھال دلہن کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی ہے۔ کوہستانوں اور جنگلوں میں بے قیمت نغمے گائے جاتے تھے۔ یہاں نغمے بھی بکتے تھے اور آزاد لوک گیتوں کے بالمقابل اس بازار کے نغمے مجھے صدیوں سے پٹتے آ رہے، بھوکے غلاموں کے بھیس میں نظر آ رہے تھے۔

ایک الاؤ ہی تو تھا یہ نغموں کا آشیانہ اور ہم تینوں مسافر اس آگ کے گرد بیٹھے پالے سے بچنے کا جتن کئے جا رہے تھے۔ مہتہ کے لئے یہ بالاخانہ سب کچھ تھا جنیفت اور میں ان نغموں کے نئے گاہک تھے اور نرگس کی شرابی انگڑائیاں ہمیں برابر گرما رہی تھیں۔ جنم ہی سے نرگس آنکھوں میں کاجل ڈلوا کر لائی تھی۔ گہری سبز شلوار قمیص، اس پر نیلون کا سفید دوپٹہ، بٹی ہوئی رسّی کے روپ میں گلے کا ہار بنا ہوا۔ گردن کے گرد بالوں کے بھرپور لچھے لٹک رہے تھے۔ جن سے ایک بھینی بھینی سی سگندھ اُڑ کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔ وہ یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی دیو داسی اپنے دیوتا کے بردان سے دیوی بن گئی ہو۔ مہتہ نے مشتاق نگاہوں سے نرگس کے بیند ماتے حسن کا جائزہ لیا۔ نرگس نے ایک بے حجاب انگڑائی لی۔ مہتہ بولا:۔ "یہ تمہیں یوں دیکھ کر ایک شہزادی کی بات یاد آ گئی، نرگس

وہ سو سال تک پڑی سوتی رہی۔ پھر ایک شہزادہ آیا اور اُس نے اس نیندوں کی دلاری کو جگایا۔"

ساری محفل میں ایک لطیف سا قہقہہ گونج اُٹھا۔ نرگس کے کنوارے حُسن سے لپٹی ہوئی گرد بھی اُترتی نظر آئی۔ اس نے ایک بار آنکھیں ملیں اور اپنے صندلی ہاتھ کولھوں کی کہساروں پر ٹکا کر خاموش نگاہوں سے مہتہ کی طرف دیکھا۔ مہتہ نے پھر چٹکی لی۔ "تو جاگنے پر بھی وہ شہزادی پانچ چھ ہفتوں تک آنکھیں ملتی رہی ہوگی نرگس!"

نرگس حیران تھی کہ وہ اب کیا جواب دے۔ بولی "یہ بھی آپ نے ایک ہی کہی کہی مہتہ صاحب، وہ شہزادی یہاں ہو نہ ہو وہ شہزادہ یقیناً یہاں موجود ہے۔"

پھر نرگس نے پیچھے مڑ کر اُستاد جی کو نغمہ چھیڑنے کا اشارہ کیا۔ سارنگی پر دیس کے سُر گونج اُٹھے۔ ابھی نرگس کے گلے سے سُر نہ نکلے تھے۔ مہتہ نے موقع پا کر اپنی بات پھر دوہرائی۔ "آج تو میں وہ نغمہ سُنوں گا نرگس، جسے مغل شہزادے خوش ہو کر سُنا کرتے تھے۔"

نرگس کے لئے چُپ رہنا مشکل تھا۔ بولی "اتنے پرانے وقتوں کا نغمہ میں کہاں سے لاؤں گی؟"

مہتہ کہہ اُٹھا۔ "اتنے پرانے وقتوں کا نغمہ اُڑ کر کہاں جائیگا؟ میرا مطلب اس نغمے سے ہے، نرگس، جو شہزادی نے سو سال کی نیند سونے سے پیشتر گایا تھا۔"

نرگس مسکرا رہی تھی۔ وہ ضرور کوئی پرانا نغمہ ٹٹول رہی تھی۔ سارنگی کے تاروں پر

اُستاد جی کی نگاہیں یوں گھوم رہی تھیں جیسے کوئی بطخ کسی تالاب کی سطح پر نہایت اطمینان کے ساتھ لکیریں اور دائرے ڈالتی چلی جاتی ہو۔ دھیرے دھیرے ایک نغمہ جھومتا جھامتا فضا میں سما گیا:-

من کی تلیا سوکھی پڑی ہے

ایک بوند برسا جا......

نغمہ کے ختم ہونے پر حنیف نے پوچھا: "کیوں جی بائی جی، یہ گیت آپ نے ریڈیو پہ بھی گایا تھا جی؟"

نرگس بولی: "جی ابھی تک تو نہیں۔"

طبلچی نے چٹکی بجائی: "ریڈیو پر تو ہماری بائی جی یوں گاتی ہیں بابو جی، جیسے چڑیا اپنے بچے کے منہ میں دانہ ڈالتی ہے...... اور پھر لاکھ ریڈیو بن جائیں بابو جی نقل نقل ہے، اصل اصل۔"

طبلچی کی مسکراہٹ اُبھر کر اوپر نہ آسکی۔ طبلہ بجاتے بجاتے اس کی جوانی بیت گئی تھی۔ اس کے دیکھتے دیکھتے پہلے گراموفون آیا اور پھر یہ ظالم ریڈیو بھی آگیا۔ گراموفون کے ریکارڈ کس طرح اصل گانے کی نقل اُتار دیتے تھے، یہ بات اس کے لئے پہیلی بن کر رہ گئی تھی۔ بائی جی سوئی ہوں یا جاگی ہوں، بیمار ہوں یا بھلی چنگی، ان کا گایا ہوا ریکارڈ جب چاہو بجالو۔ اور یہ ریڈیو والے تو اور بھی غضب ڈھاتے تھے۔ بائی جی ریڈیو اسٹیشن پر بیٹھی گا رہی ہیں اور اُن کا نغمہ گھر گھر سنا جا رہا ہے۔ یہ

بائی جی کے ہاں اب کون آئیگا؟ اور یہ مشین کا جادو اس کی سمجھ بوجھ سے باہر تھا۔

نرگس کہہ رہی تھی۔ "میری طبیعت پر آج کچھ بوجھ سا پڑا ہوا ہے۔ لیکن آپ آئے ہیں۔ میں ضرور گاؤں گی۔"

حنیف نے اپنے ہمسفروں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا: "(That's allright (وہ سب ٹھیک ہے) ہم چلتے ہیں، ہم نیک ہیں، ہم نیکوں کی قدر کرتے ہیں۔"

مہتہ کمبخت کہاں ماننے والا تھا، بولا "اور بھائی میرے ایسی بھی کیا جلدی ہے چلتے ہیں بس تھوڑا رکو۔ ہاں تو یاد رہے اشرفیاں دونگا میں بھی ایک دن نرگس کو۔"

نرگس مسکرا رہی تھی۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے کوہستانوں اور جنگلوں میں دیکھے ہوئے حُسن و عشق کے نظارے پھر سے زندہ ہو اُٹھے ہوں۔ بات کو روکتے ہوئے میں نے کہا۔ "یہ جو نغمہ ابھی گایا گیا تھا۔ کونسا راگ تھا بھلا؟"

طبلچی نے کہا۔ "وہ دیپک راگ تھا جی!"

حنیف جھنجلایا۔ بولا "دیپک؟ وہ تو دیس تھا دیس، ہم لوگ بچے نہیں ہیں جی۔"

نرگس نے معافی طلب نگاہوں سے حنیف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جی دیس ہی تو تھا۔ ہمارے طبلہ ماسٹر نے یونہی کہہ ڈالا۔ ہر وقت پیٹ کی آگ یاد رکھتے ہیں یہ لوگ۔ دیس بھی ان کو دیپک معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر سچ تو یہ ہے کہ دیپک کو دیس بنتے کونسی دیر لگتی ہے۔ اسے اشرفیاں دکھاؤ، ابھی دیس بن جائے گا! ..... ٹھنڈا شیتل سا دیس!"

حنیف نے سکھ کا سانس لیا اور بولا "چلتے رہیں ہمارے کارخانے!"

نرگس نے ایک اور نغمہ چھیڑا۔ ہر قدم پہ مہتہ نرگس کی داد دیتا جاتا تھا۔ شکریہ کے لئے نرگس کا ہاتھ ریل کے گارڈ کی جھنڈی کی طرح اُٹھ جاتا تھا ہر بار مہتہ کی واہ واہ سے ہم آہنگ ہو کر حنیف اپنے مزدوروں کو ڈانٹ رہا تھا۔ "اچھی پلپ تیار کرو حرامزادو کارخانہ ہے کارخانہ ۔۔۔ کاغذ کا کارخانہ تمہارے ابا کا مکان نہیں! اور نرگس گویا اس کارخانہ کی آواز پر بھی جھنڈی ہلا دیتی تھی۔

جنگ کی وجہ سے کاغذ کا بھاؤ بہت چڑھ گیا تھا۔ اور جس بھاؤ چور بازار میں ایل کا کاغذ بک رہا تھا۔ تقریباً اسی بھاؤ پر حنیف کی کاغذ فیکٹری کا دستی کاغذ۔ جو دیکھنے میں اینٹک پیپر کا باپ معلوم ہوتا تھا۔ بک جاتا تھا۔ اس کی وجہ صرف کاغذ کی کمیابی ہی تھی ورنہ جنگ سے پہلے تو کاغذ کی فیکٹری کھولنے کا خیال نرا گھاٹے کا سودا تصور کیا جاتا کہاں سائیکالوجی کا ایم۔ اے اور کہاں دستی کاغذ کی فیکٹری کا پروپرائٹر۔ حنیف کی بے ربط بڑ پر دھیان دینے کی مجھے چنداں ضرورت نہ تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "صبح نو بجے تو ہماری گاڑی چل ہی دیگی ...... لاہور اچھا ہے ...... یہ نغمے بھی اچھے ہیں۔ اور وہ ہمارے کارخانے بھی!"

نرگس نے اپنے نئے گاہک کو برمانے کے لئے اُٹھ کر پان کی طشتری پیش کی

حنیف گھبرا گیا بولا "اتنی چیزیں بائی جی!"

چھالیہ کے چند باریک ٹکڑے اُٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے حنیف نے جھٹ

ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔ شاید اُسے وہ بچپن کا سبق یاد آ گیا تھا ــــ اِس ہاتھ لو اُس ہاتھ دو۔ اِس پر مہتہ نے فقرہ کسا ــــ "جب ہم اپنی تعلیم کر چکتے ہیں تو بعض اوقات لوٹ کر جانا ہوتا ہے۔ اُنہیں دوسری تیسری اور چوتھی جماعتوں میں۔"

حنیف نے تین نوٹ نکالے اور نرگس کی طشتری میں رکھتے ہوئے بولا "یہ دونوں میرے دوست ہیں بائی جی، جی آپ یقین فرمائیں۔ ہم تین ہیں۔ یہ نوٹ بھی تین ہیں۔ یہ۔ . . . . . . یہ دوست میرے اور وہ کارخانے میرے۔ کون بند کر سکتا ہے، جی اُنہیں؟ میں تو چلا ہی جاؤں گا۔ یہ آتے رہیں گے۔"

ہماری نظریں نرگس کے لال فرش پر گڑی جا رہی تھیں۔ کبھی جی چاہتا تھا کہ نوٹ ہم اٹھا لیں اور کبھی جی میں آتا کہ حنیف کو اُٹھا کر دریچے کے باہر دے ماریں۔ لیکن حنیف کا معصوم چہرہ ایسی کسی حرکت کی اجازت نہ دیتا تھا۔

نرگس اپنی جگہ پر بیٹھ چکی تھی۔ میرا ذہن جنگلوں اور کوہستانوں کی طرف گھوم گیا۔ لیکن نرگس نے میری راہگزر پر مسکراہٹ ہی مسکراہٹ بکھیر دی اور میرا اُفق بدلتا چلا گیا۔

طبلچی کہہ رہا تھا "جم جم آئیں یہ نیک۔ بنی رہے ہماری دال روٹی۔"

حنیف بولا "کبھی صرف دال روٹی دینے والے آ جاتے ہیں جی، کبھی گوشت حلوا دینے والے۔ اور ہوتے وہ بھی ہمارے ہی جیسے ہیں جی۔ اور ہمارے کارخانوں کو وہ بھی بند نہیں کر سکتے۔ جی ہاں جی۔" میں اچانک اکتا گیا۔ آخر یہ من کی تتلیاں بھی کب تک

شو کبھی رہے گی جی؟ دنیا کی ہر چیز ایک نہ ایک دن میرا مطلب ہے جی گویا ایک نہ ایک دن یعنی ایک دن...... چلو جانے دیجئے جی ___ کبھی گوشت حلوا دینے والے بھی..
.... جی بائی جی آپ کا...... اُستاد کون ہے جی؟"

نرگس نے اپنے سازندوں کی طرف اشارہ کیا۔" جی یہ سب میرے اُستاد ہیں!"

حنیف اپنے پروفیسروں کے متعلق سوچنے لگا۔ ڈاکٹر مونگا کا دلچسپ انداز، ان کا وہ لڑکے لڑکیوں کے روبرو جنس اور جنسی تجزیئے کی کھری کھری تشریح کرنے کے دوران میں خلوص بیان اس کے ذہن کو گدگداتا رہتا تھا۔ تاش کے بادشاہ کی سی اُن کی مونچھیں اُس کے نفسِ لاشعور پر بے پناہ نقش چھوڑ جاتی تھیں۔ لیکن خالی تقریروں اور مونچھوں سے تو زندگی کی خلیج پر پُل نہ باندھا جا سکتا تھا۔

نرگس کی گہری سبز شلوار اور قمیص اور وہ دلیس کا دھیما دھیما الاپ، یہ دونوں چیزیں کچھ اس قدر ہم آہنگ اور معنی خیز نظر آئیں کہ حنیف نے سوچا، نرگس کا نغمہ تو ڈاکٹر مونگا کی پانچ تقریروں پر بھاری ہے۔

جہتہ کہہ رہا تھا۔" دنیا لہولہان ہو رہی ہے۔ خیر ہمارے ہندوستان کی جنگ ہم سے دور ہے مگر جنگ سے پہلے قحط آ گیا۔ بنگال بھوکا ہے گیہوں مہنگا ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔" گیہوں ہی مہنگا ہو رہا ہے یا نغمے بھی؟"

حنیف بولا۔" جی کیا صرف روٹی کی بھوک ہی بھوک ہے؟ شام کو سینما گھر کی کھڑکی پہ کھڑے ہو کر دیکھئے۔ جی میرا مطلب ہے چار آنہ والی کھڑکی پر کس قدر بھیڑ ہوتی ہے

یہ جُگنو کے نہیں تو اور کیا ہیں؟"

مہتہ بولا "اور یہاں ہم بھی بیٹھے ہیں!"

نرگس مسکرا رہی تھی۔ مہتہ اس کی تعریفی نگاہوں پر جان دیتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اس وقت کوئی طنز لہرا رہی تھی۔۔ وہ بولی "یہ آپ کا اپنا گھر ہے مہتہ صاحب؟"

مہتہ کہہ اٹھا "جی ہاں یہ ہمارا اپنا گھر ہے۔ تبھی تو ہم بغیر دعوت ہی کے چلے آتے ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، نرگس، کہ تمہارے نغموں کے بغیر میری زندگی یقیناً اس سبزی کی طرح ہوتی جیسے پکاتے وقت پکانے والی نمک ڈالنا بھول گئی ہو۔۔۔۔"

ساری محفل میں پھر ایک لطیف سا قہقہہ گونج اٹھا۔ حنیف نے آگے بڑھ کر کہا۔ "جی بائی جی، شروع کر دنا کوئی نمکین سی چیز!"

نرگس نے ایک نغمہ چھیڑ دیا۔

دوستِ غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

مہتہ چونک اٹھا۔ دوستِ غم خواری میں میری سعی۔۔۔ تو ہندوستان کو پھر کوئی نوچنے آئے گا۔ ابھی تو پرانے زخم بھی نہیں بھرنے پائے۔ کیا زخم ہی زخم لکھے ہیں ہندوستان کی قسمت میں؟"

حنیف چپ بیٹھا تھا۔ میں نے کہا "مہتہ بھائی، غالب کو تم سمجھے یا وہ ہمارا گاما پہلوان۔ کہاں عشق کہاں ہندوستان۔۔۔ ہندوستان کراہے نہ کراہے غالب کی روح ضرور کراہتی ہوگی"

حنیف سے بھی نہ رہا گیا۔ بولا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے جی۔"

مہتہ بولا، "لیکن برخوردار یہ سائیکالوجی شاعری ہے۔ غالب کی قبر پہ کوئی چار اینٹیں نہ لگوا سکا۔ حالانکہ دیوانِ غالب چھاپ چھاپ کر بیچنے والوں نے اپنے محل کھڑے کر لیے۔ بھئی ہم عیش کر رہے ہیں ضرور۔ مگر ہندوستان بھوکا ہے۔۔۔۔۔"

نرگس نے ایک اور غزل شروع کی۔ بالیسری اور غالب ایک ہی گھاٹ اتر پڑے تھے۔ نرگس کے گلے سے جنم جنم کا غم چھلک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رات لمبی ہوتی چلی جائے گی۔ مہتہ کہہ رہا تھا، "گائے جا، نرگس، گائے جا۔ اور میں دیکھوں گا کہ ہندوستان کو کون نوچتا ہے!"

ہم تینوں عمر خیاموں کی طرف نرگس نے خوابیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ سارنگی جدھر کو مڑتی نرگس اُدھر ہی کو ہو لیتی۔ طبلہ بھی اُدھر ہی کو تھاپ دیتا۔ سچ تو یہ تھا کہ سارنگی اور طبلہ دونوں نرگس کی کنواری لَے کے پروردہ تھے۔

نرگس کے بالوں کے لچھے جیسے لمبے ہوتے جاتے تھے، کانوں میں گول مول بالیاں اور بھی گول مول ہو اُٹھیں ۔۔۔ گول مول اور بڑی بڑی! اور اس کی آنکھوں میں کاجل کی کالی کالی لکیریں بھی زبان رکھتی تھیں۔

مہتہ نے کہا، "اچھا نرگس، چغتائی سے تو تمہارا تعارف ہوا ہوگا؟"

نرگس بولی، "کون چغتائی۔۔۔۔۔ ایک ناشاد اجمیری آتے ہیں میرے یہاں۔ کبھی کوئی چغتائی بھی آئے ہوں تو یاد نہیں۔ چند غالب اور اقبال کی غزلیں یاد ہیں۔ اور

آپ ایسے مہربان آجاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی چیز مل ہی جاتی ہے۔"

میں نے کہا "ایک فن کار دوسرے فن کار کو نہ جانے، اس سے بڑی اور کونسی ہوگی ستم ظریفی!"

منیعت بولا "جی ستم ظریفی۔"

مہتہ کہہ رہا تھا "آج غالب یہاں ہوتے تو سچ جانو وہ ضرور کہہ اُٹھتے کہ شاعر لکھتا ہے ــــ صرف لکھتا ہے۔ اور پھر اس کے شعر سو سال کی نیند سو جاتے ہیں۔ سو سال کی نیند۔ پری کہانی کی شہزادی ہی کی طرح، حتیٰ کہ کوئی نغمہ ساز، کوئی شہزادہ انہیں آن جگاتا ہے ایک دن۔"

نرگس مسکرا رہی تھی۔ "تو یہ چغتائی شاعر کہاں رہتا ہے؟"

مہتہ نے کہا "چغتائی کوئی شاعر نہیں، نرگس، وہ تو فن کار ہے۔ وہ غزلیں لکھتا نہیں کھینچتا ہے۔ جیسے کارخانہ میں وِسکی کھینچی جاتی ہے۔ غالب کے شعروں کو چغتائی نے تصویروں میں ڈھال دیا ہے۔ تم بھی تو چغتائی کی کوئی تصویر معلوم ہوتی ہو نرگس!"

نرگس نے مسکرا کر ساری فضا میں نیا رنگ بھر دیا۔ بولی "اچھا تو یہ بات ہے؟ چغتائی مصوّر۔ ہاں اس کی کئی چیزیں میں نے بھی دیکھی تھیں ایک بار!"

مہتہ نے پھر کہا "چغتائی کی تصویروں کی عورت تمہیں ہو نرگس۔"

نرگس نے انگڑائی لی۔ بولی "چغتائی کبھی میرے ہاں نہیں آیا۔ کہیں ہمارا تعارف نہیں ہوا۔ مجھے دیکھے بغیر ہی اس نے کیسے میرے خدوخال اُتار لیے؟ میں تو حیران ہوں۔"

ہم نے بیک وقت گھور کر نرگس کی طرف دیکھا، جیسے ہم کہہ رہے ہوں۔ ہم چغتائی کے دوست ہیں۔

نرگس بولی "آپ چغتائی سے ملیں تو میری طرف سے اتنا عرض کر دیں کہ وہ میرے ہاں ضرور تشریف لائیں"

چاہے تو مورا من لے لے! ــــ نرگس گا رہی تھی۔ اِسے تو ساگر ترنگ کا نام دیا جا سکتا تھا۔ بعض لہریں ساحل سے پرے پرے ہی ختم ہو جاتیں۔ لیکن کچھ ایسی بھی تھیں جو ساحل سے آ ٹکراتیں۔

نغمہ ختم ہونے پر مَیں نے پوچھا "تمہاری عمر؟"

وہ بولی "یہی کوئی اکیس برس!"

میں نے کہا "اور میری عمر ہے اَن گِنت صدیاں"

وہ بولی "ہائے! اتنا بوڑھا آدمی آج پہلی مرتبہ میرے بالاخانہ پر آیا ہے"

میں نے کہا "سچ تو یہ ہے نرگس کہ تمہاری عمر بھی اَن گِنت صدیاں ہے۔ تم ہمیشہ یہ گیت گاتی رہی ہو۔ لیکن من لینے والے اور اور کھیلوں میں مگن ہیں۔ تمہاری آواز بیکار نہ جائے گی اور نہ چغتائی کی تصویریں ہی بیکار جائیں گی جنہیں وہ ان گنت صدیوں سے بناتا آ رہا ہے"

نرگس کو سچ نہ آتا تھا۔ یہ اَن گنت صدیوں کا قصّہ بھی کتنا تھکا دینے والا تجربہ تھا۔ ہم ابھی اُٹھنے نہ پائے تھے، الاؤ ابھی بجھا نہ تھا کہ چار ہستیوں کا ایک اور گروہ

آوارد ہوُا تین افغان اور ایک کوئی پنجابی نواب زادہ!

نرگس نے ایک مسکراہٹ اپنے نئے گاہکوں کی طرف بھی پھینکی، جیسے کہہ رہی ہو، بھلے آئے پیسے والو، لیکن روپے کی قیمت تو تین آنے بھی نہیں رہ گئی۔ اور یہاں میرے نغمے بھی مہنگے ہو گئے۔ ہر چیز مہنگی ہو رہی ہے۔ اور پھر بہت دیر بھی تو ہو گئی۔

مہتہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ حنیف بڑی سہمی سہمی نگاہوں سے ان نئے عاشقوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پنجابی نواب زادہ نرگس کی اُنگلی تھام کر اُسے پرے صحن میں لے گیا اور دیر تک نہ جانے کیا کیا باتیں کرتا رہا۔ مجھے اپنی نغمہ پسندی ایک بہت بڑی بھوک نظر آنے لگی۔ اَن گنت صدیوں کی بھوک! مہتہ کی عجب حالت تھی۔ پنجابی نواب زادے کے خلاف ایک شدید غصہ آرہا تھا۔ حرامی۔ بھری مجلس سے نرگس کو اُٹھا لے گیا۔ نہ کسی شاعر کی پروا، نہ کسی فن کار کی پروا، اور نرگس کو دیکھو، نہ طبلہ و سارنگی کی کچھ لاج آئی، نہ پرانے گاہکوں کی عزّت ہی اس کی راہ روک سکی۔ نرگس جا چکی تھی، لیکن اُستاد جی کی آنکھوں میں الاؤ کو پھر سے جلا سکنے کا خیال باقی تھا۔ اور طبلچی بھی یوں بیٹھا تھا کہ ابھی حکم ہوُا چاہتا ہے اور پھر وہ بھوکے کتے کی طرح خرگوش کے پیچھے بھاگ نکلے گا۔

ہم تینوں ٹٹ پونجیئے نرگس کی واپسی کے منتظر تھے۔ اتنے میں نیچے سے سیٹی کی آواز آئی۔ نواب زادہ کو صحن ہی میں چھوڑ کر نرگس بھاگی بھاگی آئی۔ بولی۔ "اچھا جی۔ آداب عرض ہے سیٹی بج رہی ہے، ایک بج چکا۔ اب اور زیادہ حکم نہیں فرنگی کا۔"

ہو فتح شناسی ضروری تھی۔ ہم خوشی خوشی نرگس سے رخصت ہوئے اور نیچے چلے آئے

سڑک پر سیٹی بجانے والا سپاہی کھڑا تھا۔ وہ کوئی جادوگر معلوم ہوتا تھا۔ جس کی ایک ہی پھونک نے نغموں کے سب چراغ گل کر دیئے تھے۔

مہتہ کو باوردی لوگوں سے چڑھ تھی۔ اُس نے جھنجلا کر کہا۔" ان ذاتِ شریف کو بھی دیکھ لو۔ کس اطمینان سے سڑک پر مسلّط ہیں ―― بے جان کھمبوں کی طرح۔"

میں نے کہا۔" ان لوگوں کو مت چھیڑو۔ یہ کھمبہ لپٹ گیا تو گھر تک نہ چھوڑے گا۔"

مہتہ نے جھنجلا کر کہا۔" یہ بیچارہ مجھے کیا کہے گا۔ وہ تو ٹکوں کا غلام ہے۔ وہ خود غلام اس کی سیٹی غلام۔"

سپاہی کی نگاہ سُونے بالاخانوں پر تھی۔ لیکن اس کے کان ہماری طرف تھے۔ اس نے اپنی نظریں مہتہ کے چہرے پر گاڑ دیں اور قریب آتے ہوئے زہر آلود طنز سے کہا۔ "ابھی آپ کو ہم لوگوں سے پالا نہیں پڑا۔ میں جس ٹہنی پر بیٹھ جاؤں وہ ٹہنی سُوکھ جائے، میری اُلّو کی خاصیّت ہے۔ جس گھاس پر پھنکار ماروں وہ گھاس جل جائے۔ سانپ کی خصلت ہے میری۔ یوں دیکھنے کو میں امن کا نشان ہوں۔"

ہمارے قریب ایک نئی کار کھڑی تھی۔ وہ تینوں افغان اب اس کار کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان کا ہمراہی وہ پنجابی نواب زادہ بھی آ گیا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے خود نرگس بھی چلی آئی تھی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ سب لوگ کار میں گھس گئے۔ اور کار نئی دہلی کی طرف روانہ ہو گئی۔

مہتہ کو محسوس ہوا کہ چغتائی کا سارا فن چوری ہو گیا۔ حنیف کی گردن جھک گئی تھی

مہتہ نے سنبھل کر چٹکی لی "او بھائی میرے نرگس کا خیال چھوڑ دو۔ وہ اس جیل خانے میں پھر کاہے کو آئے گی۔ وہ تو ہندوستان کی رُوح ہے جو آزاد ہو کر نکل بھاگی ہے۔"

حنیف کو غصّہ آ گیا۔ بولا "مجھے بھی آزادی چاہیئے۔ لاہور پہنچکر میں کاغذ فیکٹری سے سب رشتہ توڑ ڈالوں گا۔ مَیں تو ایک جہاز ہوں کسی ایک ہی بندرگاہ پر رُکنا میرا کام نہیں۔"

مہتہ کہہ رہا تھا "میں بھی کل اپنی ایک چوتھائی انچ لمبی داڑھی کٹوا ڈالوں گا۔ میرے سپنوں کی رانی جمنا اکثر کہتی رہتی ہے "میں تمہیں کیسے پیار کروں مہتہ؟ تم تو پہچانے ہی نہیں جاتے۔ نہ ہندو معلوم ہوتے ہو نہ مسلمان!"

اور خود مجھے دُور دور کے کوہستان اور جنگل نزدیک آتے دکھائی دے رہے تھے کئی بجھے ہُوئے دیئے پھر سے جگمگا اُٹھے۔ کسی غیر مرئی ہاتھ نے ٹمٹماتے دیوں کی بتیوں کو پھر سے اُکسا دیا تھا۔ میرے ذہن کے کلابھون میں وہ سنتھال دلہن اُسی طرح کھڑی تھی پلاس کے لال لال پھول ابھی تک اُسے نصیب نہ ہو سکے تھے۔ وقت اُڑا جاتا تھا۔ عمر خیام سچ کہتا تھا۔ اور میلے کو جانے والے لوگوں کی دیکھا دیکھی اس نے بغیر پھولوں ہی کے جوڑا باندھنا شروع کر دیا تھا۔

بٹائی کے دِنوں میں

پچھم کی طرف سے آنے والی ہوا کے نیچے گیہوں کے پودے سر ہلا رہے تھے کنکوت کے لیئے ریاست کا سرپنچ کھیت کی مینڈ پر کھڑا تھا۔ دیوان صاحب کا آدمی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ فصل کا جائزہ لیتے ہوئے سرپنچ نے فیصلہ کیا کہ کوئی ساٹھ ایک من دانے ہونگے۔ جو کام پہلے آدھ گھنٹہ مانگتا تھا۔ اب چند ہی منٹوں میں ختم ہو جاتا تھا۔ کسان نمائندہ موجود رہتا تو اب کے یہ بے نظیر ہمواری کنکوت کی خصوصیت ہرگز نہ ہونے پاتی۔

کنکوتیئے بہت دور نکل گئے تھے۔ سنتو اپنے دل میں حساب لگانے لگا۔ اس کا مطلب ہوا بیس من دیوان کے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں مہینوں محنت کرتا رہا ہوں میں نے خون پسینہ ایک کیا ہے۔

اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تو سنتو چھ فٹ کا جوان دکھائی دینے لگا۔ کھلے ہاتھ پاؤں گلے میں پڑا ہوا تعویذ ٹوٹے ہوئے کان، وہ پہلوان دکھائی دیتا تھا۔ تہمد کو اُدپر اٹھا کو لھوں

پر رکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا...... بیس من...... ہم آج تک دیوان کو اپنی زمینوں سے
کھلاتے رہے ہیں۔ سارا سال زمین میں ہل جوتیں ہم بیلوں کے ساتھ بیل نہیں ہم اور پھر جب
ہماری محنت کے نتیجے میں دھرتی کی آشائیں آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ اناج ہی اناج
ہو جاتا ہے تو دیوان کہتا ہے کہ میرا حق پہلے مجھے مل جائے زمین اصل میں میری ہے
اجاگر نے آکر بتایا کہ اس کے کھیت کی کنکوت بھی ہو گئی۔ کنکوتئے پچاس من
دانے لکھ کر لے گئے ہیں۔ اجاگر نے اپنے چادرے کو گلے سے اتارا اور ہاتھ پھیلائے
وہ ایک بڑا سا پرندہ دکھائی دینے لگا۔ جو اڑ کر آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرنے والا
ہو۔ سنتو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولا۔ "میں کہتا ہوں دیوان ریاست کے
سر پنچ سے ملا ہوا ہے۔ یہ کنکوت کا طریقہ بھی کتنا برا ہے۔ بیکار ہی ہم کنکوت کے لیے
لڑتے رہے تھے۔ اب بھلا میرے کھیت میں پچاس من دانے کہاں ہوں گے؟ اس
تو یہی اچھا تھا پہلے کی طرح کٹائی ہو چکنے پر ہماری جنس تول لی جاتی اور دیوان کے
حصے کا ایک تہائی اناج دیوان کے گھر پہنچا دیا جاتا۔"

دھار جیو اس اثنا میں رہٹ کی گادھی پر آ بیٹھا تھا۔ اجاگر کی بات پر وہ خ
رہا۔ سنتو نے اپنی نوخیز مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور سامنے پیپل کے نیچے سمادھ کی ط
دیکھتا ہوا بولا۔ "سوگند ہے مجھے بابا ٹہل سنگھ کی اگر میں دیوان کو ایک دانہ بھی د
جاؤں۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ زمین ہماری ہے۔ شہر سے آنے والا بابو جی
دن بھر یہی بتا رہا تھا۔"

بڈھا رحیمو ایک ڈرپوک آدمی تھا اور ریاست کے ہر معاملے میں مصلحت کے طور پر جبر کے آگے سر جھکا دیا کرتا تھا۔ اُس میں مصیبت اور ظلم سے جنگ کرنے کی صلاحیت مر چکی تھی۔ حقے کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے وہ کھانس کر بولا "ارے سنتو جانے بھی دو۔ دس بیس سیر دانے زیادہ بھی دینے پڑ گئے تو کیا ہو گیا؟ ایسا نہ ہو کہ تجھے پیاز بھی کھانے پڑیں اور جوتے بھی۔ یہ پیاز اور جوتوں کا وہ قصہ بھی سُنا ہے نا؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی وہ سنانے لگا:۔

"ایک تھا جولاہا۔ پتہ نہیں سالا کیا قصور کر بیٹھا کہ پنچایت میں ایک دن یہ طے پایا کہ وہ چاہے تو سو جُوتے کھا لے، چاہے تو ایک سو پیاز کھا لے۔ اُس نے کہا۔ پیاز منگوا لو۔ اُس نے دس بارہ پیاز بھی نہ کھائے ہوں گے کہ سالا تنگ آ گیا۔ بولا —— پیاز کھانا کٹھن کام ہے، جُوتے ہی کھا لیتا ہوں۔ پھر اُس کے سر پر تڑاتڑ جوتے پڑنے لگے اُس کی چیخیں نکل گئیں۔ بولا —— جوتے نہیں —— پیاز —— پیاز، سرپنچ بادشاہ! لیکن وہ لگاتار اتنے پیاز بھی نہ کھا سکتا تھا۔ پھر جُوتے، پھر پیاز، پھر جُوتے، پھر پیاز آخر حساب کرنے پر پتہ چلا کہ سالا سو کے سو جُوتے بھی کھا گیا اور کوئی ایک کم سو پیاز بھی۔"

سنتو اپنے ڈھیلے تہمد کو درست کرنے لگا۔ اُجاگر بھی کچھ نہ بولا۔ رحیمو گادھی پر بیٹھا حقّے کے کش لگاتا رہا۔ بیچ بیچ میں اُس کی آنکھیں مچ جاتیں شاید اُسکے دماغ میں بھولے بسرے دھندلے دھندلے خیالات تیر رہے تھے۔ کوئی اور سماں ہوتا تو سنتو کو رحیمو کے جھریوں والے

جُتتے ہوئے کھیت جیسے چہرے پر ان آنکھوں کی یہ کیفیت دیکھ کر کسی مندر کے پٹ بند ہونے اور کھلنے کا گمان ہونے لگتا۔ اُس نے سوچا کہ رحیمو اُس پرانے رہٹ کی طرح ہے جو ہمیشہ ایک ہی سُر میں اپنا الاپ جاری رکھتا ہے۔ سر سے پاؤں تک اُس کے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ "کھیتوں کے دیوان تو ہم کسان خود ہیں ـــــ خود کسان رحیمو چچا۔" وہ بولا۔ "میں اب کے ایک دانہ بھی دیوان کو دے جاؤں تو مجھے سنتو مت کہنا۔ کچھ پروا نہیں اگر مجھے پیاز بھی کھانے پڑیں اور جوتے بھی کھانے پڑیں۔"

اُجاگر نے قہقہہ لگایا اور رحیمو کی داغی بیروں جیسی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بابا! میں تو باز آیا پیاز اور جوتے کھانے سے۔"

گیہوں کی بالیاں سائیں سائیں کی آواز کے ساتھ ہوا کی تیز رفتاری کا قصہ بیان کرنے لگیں۔ بادلوں کے ملگجے گہرے سائے دور تک پھیل گئے تھے۔ قریب ہی ایک پگڈنڈی تنی ہوئی تھی جس پر ایک دلہن قطار سے بچھڑی ہوئی کونج کی طرح اپنی دُھن میں چلی جارہی تھی۔ اُس کی پازیب کی جھنکار آہستہ آہستہ خاموش ہوگئی۔ رحیمو چچا نے حقے کا ایک پُرزور کش لگایا۔

اُجاگر رحیمو چچا کی باتوں میں اُلجھ کر رہ گیا۔ لیکن سنتو اپنی تیل پلائی ہوئی لوہے کے مُٹھے والی لاٹھی اُٹھا کر گاؤں کی طرف چل پڑا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں مٹھے کی ہموار سطح پر پھیل گئیں۔ دور کہیں سے گیت کی آواز آرہی تھی ـــ "کوئی لے گیا بھگت چُرا کے ہے ریہے دیاں ویداں نوں!" . . . . . نغمے ـــ

زیر و بم نے سنتو کو بیقرار کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے اسے دنیا بھر کی بے انصافی کا راز معلوم ہو گیا۔ برہما کے پاس وید ہی نہیں رہے۔ نہ جانے کون بھگت انہیں چرا لے گیا۔

اوپر آسمان پر رات کا دولہا سنجیدہ نظر آتا تھا۔ گیہوں کے کھیت چاندنی میں اونگھ رہے تھے۔ سرپنچ کے الفاظ سنتو کے ذہن میں سوئیوں کی طرح چبھنے لگے۔۔۔ کوئی ساٹھ ایک من دانے ہو نگے! فصل میں ایک تہائی حصّہ دیوان کا نہ ہوتا تو وہ کسی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اُس کا مرید بن جاتا۔ اور کہتا، واگورو کا پرتاپ چاہیئے، ساٹھ کے بھی اسّی من دانے نکلیں گے۔ کُل ساٹھ من دانے!۔۔۔ یعنی بیس من دیوان کے، اور میرے پاس رہ جائیں گے کُل چالیس من! اُس کے منہ کا مزہ پل بھر میں ناخوشگوار ہو گیا۔ جیسے اس کی زبان کچّے پیلو کو اُگل کر باہر پھینک دینا چاہتی ہو۔ وہ کوئی شاعر ہوتا۔ تو سرپنچ کی ہجو میں ایک لمبی نظم لکھ ڈالتا۔ جس کے ایک ایک لفظ میں دنیا بھر کی نفرت پرو دیتا۔ اور اس وقت سرپنچ کہیں ملجاتا، تو لوہے کے مٹھے والی لاٹھی اسکے سر پہ اتنے زور سے برستی کہ وہ دیکھتے دیکھتے زمین پر گر پڑتا۔ اس کی رگیں ہونج کی بوسیدہ رسیوں کیطرح ایک بھرپور ہاتھ کا زور بھی نہ سہہ سکتیں۔ اور وہ دیوان کا آدمی، جسے ہمیشہ مونچھوں پر تاؤ دینے سے کام رہتا ہے، ایک بچکے ہوئے لہوٹے کی طرح نظر آتا۔ ایک ہی وار کے بعد اُس کی آنکھیں چاند کی طرف اٹھ گئیں، چاند اسے گھور رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو، یوں نہیں بند ہونے کی یہ برسوں سے چلی آنے والی ٹبائی، مورکھ! ایک سرپنچ کو مار ڈالو گے، دوسرا کوئی اس کی جگہ کھڑا نظر آئے گا۔ دیوان کو تو ایک چھوڑ بیس ملازم مل سکتے ہیں۔ وہ چاہتا

تھا کہ چلا کر چاند کو بتا دے گی کہ جاگی ہوئی بغاوت اب سوئے گی نہیں۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ کوئی بھوت اُس کے بس میں آ جائے اور رات گذرنے سے پہلے پہلے اس کا اشارہ سمجھ کر سب کے سب کھیت جلا ڈالے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسان برباد ہو جائیں گے۔ اور مجبوراً اپنی ماتر بھومی کو چھوڑ کر دور کسی شہر کی طرف چل پڑیں گے۔ مگر کم از کم اس چاٹ کو پیاس بجھانے کی نوبت نہ آئے گی۔ کھیتوں میں کھڑی ہوئی فصلیں جل کر راکھ ہو جانے پر دیوان کو بھی نانی یاد آ جائے گی۔ پھر کس سے بٹائی لے گا؟

اُس کی آنکھیں ایک بار پھر چاند کی طرف اُٹھ گئیں۔ چاند اسے گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو، ارے کل کے چھوکرے! تیری عقل کو کوئی بھینس تو نہیں چر گئی؟ یہ بھی کوئی طریقہ ہے دیوان سے دشمنی مول لینے کا؟ تم چلے جاؤ گے تو اور لوگ آئیں گے۔ یہاں تو تمہاری ہی طرح بیلوں کے ساتھ بیل بن کر کھیتی کریں گے اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کا ایک تہائی اپنے دیوان کو دیتے رہیں گے۔ اب یہ بٹائی بند نہیں ہونے کی۔ اس پر قانون کی مُہر لگ چکی ہے۔

اس کے قدم اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ یہ اندر ہی اندر جسم کے مختلف حصّوں تک سُرنگیں کھودنے کی فکر میں سرگرداں ہوں۔ یہ اس کے لئے ایک نئی چیز تھا۔ جیسے اس کے دل و دماغ میں یہ ڈگمگی کی طرح مسلسل کبھی ختم نہ ہوگی۔ چاند پر ایک سرکش بادل چھا گیا۔ اور اب یہ ایک اندھا لیمپ معلوم ہوتا تاروں میں بھی ایک مری ہوئی روشنی باقی تھی۔ راستے کے کنارے کنارے کھڑے

درخت بیحد بھیانک اور پُر اسرار نظر آتے تھے۔

اب وہ وہاں پہنچ گیا تھا، جہاں راستہ نیچے کو اترتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ کسی زمانہ میں یہاں سے ایک دریا گذرتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ دریا بھی راستہ بدل لیتے ہیں مگر ہم نے انسان ہو کر پرانے راستوں سے لو لگا رکھی ہے۔ دور کہیں سے بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی آواز آرہی تھی، جیسے راہگیروں کی خوش گپیاں بیچ بیچ میں چھڑ جاتی تھیں۔ دریا کا خشک پاٹ ختم ہونے پر راستہ اُوپر کو چڑھنے لگا۔ جونہی وہ اونچی سطح پر پہنچا اس کے دماغ میں ایک گیت کے سُر گھومنے لگے، جس میں گیہوں سے یہ التجا کی گئی تھی کہ وہ اب کے مہنگے بھاؤ بک کر دکھائے۔ گیہوں کا بھاؤ بھی بدلتا رہتا ہے۔ انسان کو بھی بدلنا چاہیئے وقت کے ساتھ ساتھ۔ اب کسانوں کو چاہیئے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اور اپنے بھلے کی کوئی راہ نکالیں بٹائی بند کرا دیں۔

گھر پہنچتے ہی وہ کھاپی کر کھردری کھاٹ پر لیٹ گیا۔ وہ چُپ چاپ پڑا رہا۔ بٹائی کے خلاف شور مچانے کا خیال اس کے ذہن میں زور پکڑتا گیا۔ کسان آخر کسان ہیں۔ نرے ریشم کے کیڑے نہیں ہیں جو دھیرے دھیرے اپنے کو سنہری کوئیوں میں لپیٹتے چلے جاتے ہیں۔ اور اپنے گرد شہتوت کے سبز پتے دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ اُن کا ننھا سا سورگ ہمیشہ کے لئے آباد رہیگا۔ جبتک یہ بٹائی قائم ہے۔ ہمارا گاؤں سُکھ کا سانس نہیں لے سکتا۔ کوئی ساٹھ ایک من دانے ہونگے۔ یعنی بیس من دیوان کے۔ پر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سوگند ہے مجھے بابا ٹہل سنگھ کی اگر گیہوں کا ایک بھی دانہ کسی کے کھیت سے بھی دیوان کے گھر جانے دوں

گاؤں کی تاریخ، جو وہ چچا رحیمو سے مزے لیکر سنا کرتا تھا، اس کے ذہن میں منڈلانے لگی۔ پرانے وقتوں میں جب ریاست کی بنیاد بھی نہ رکھی گئی تھی، اس کے گرد و نواح میں بڑی بد عملی پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں نہ کہیں سے ڈاکو آنکلتے اور لوگوں کو لوٹ کر چلتے بنتے پھر ایک گھڑ سوار بہادروں کا ایک گروہ آیا۔ یہ سب ایک ہی کنبے کے آدمی تھے۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ ان کی حفاظت کیلئے یہیں رہا کریں گے۔ لوگوں نے انہیں بخوشی اپنی اپنی فصل کا ایک چوتھائی حصّہ بطور شکر گزاری دینا شروع کر دیا۔ اس اثنا میں ریاست کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ اور اس کی حدود دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ مگر ہمارے گاؤں پر ریاست کا قبضہ نہ ہوا۔ گھڑ سوار بہادروں نے یہاں اپنی چھوٹی سی خود مختار حکومت قائم کر رکھی تھی۔ پھر جب سکھوں کا راج ختم ہو گیا۔ اور ہمارا گاؤں عملداری میں آ گیا۔ تو سرکار نے اپنے بندوبست میں بٹائی منسوخ کر دی۔ اور اس کی بجائے دیوان کے لئے نقد رقم کی صورت میں لگان مقرر کر دیا۔ بعد ازاں یہ گاؤں ریاست کو دیدیا گیا۔ دیوان چاہتا تھا کہ مہاراج اپنے خاص حکم سے نقد لگان کی بجائے پھر سے بٹائی رائج کر دیں۔ لیکن مہاراج نے کہا، میں زبردستی نہ کرونگا۔ اگر خود کسانوں کو رضا مند کر لو تو میں منظوری دے سکتا ہوں دیوان نے ہمارے باپ، دادوں کو نشہ پلا کر اپنے کاغذ پہ ان کے انگوٹھے لگوا لئے مہاراج نے بھی منظوری دے دی۔ دیوان نے سرکردہ کنبوں کو اپنی طرف سے رشوت دے رکھی تھی وہ کچھ نہ بول سکتے تھے۔ پھر بٹائی شروع ہو گئی۔ ایک چوتھائی کے بجائے ایک تہائی۔ چچا رحیمو کا خیال تھا کہ یہ سب خدا کی باتیں ہیں۔ اُسی کے حکم سے پرانے راج جاتے ہیں۔ اُس

کے حکم کے بغیر تو پتہ تک نہیں ہل سکتا۔ آدمی کو چاہیئے کہ چپ چاپ اس کا حکم مانتا چلا جائے۔ کوئی باغی خدا کی لاٹھی سے بچ نہیں سکتا۔ بٹائی نہیں ٹوٹنے کی۔ راجہ کا حکم اس کے ساتھ ہے، خدا کا حکم بھی اس کے ساتھ ہے۔ لیکن یہاں پہنچ کر سنتو کا اندازِ فکر چچا رحمبو کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ یہ صرف ان کے اجداد کی مصلحت پسندی کی ایک دلیل ہے کہ انہوں نے حالات کے ماتحت ڈاکوؤں سے بچنے کے لئے چند بہادر گھڑسواروں کو اپنا سرپرست منظور کر لیا۔ اور اب تک ہم ان کے خاندان کو بٹائی دے رہے ہیں۔ اب اگر مہاراج ایک تہائی کی بجائے ایک چوتھائی بٹائی کا حکم دیں تو بھی ہماری تسلّی نہیں ہو سکتی۔ ہم چاہتے ہیں ہماری گردنوں پر ظلم کی اس تلوار کا چلنا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔ ہمیں نہ نقد لگان دینا منظور ہے نہ یہ بٹائی ـــــ یہ سسری بٹائی!

انگڑائی لے کر اس نے کروٹ بدل لی اور سوچ میں ڈوب گیا۔ اپنے ذہن میں اُسے وہ تھر تھر کانپتا ہوا بکرا صاف نظر آ رہا تھا جس نے دو کسانوں کو اس بات پر اُلجھتے دیکھ کر کہ بکرے کو ذبح کرنے کا اصل طریقہ جھٹکا ہے یا حلال، تڑپ کر کہا تھا ـــــ کاش کوئی میری رائے بھی پوچھے......

اُسے یاد آیا کہ شہر سے آنے والے اس بابو نے ایک بار اسے بتایا تھا کہ شروع تاریخ سے ہمیشہ سے سرکار کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ کسانوں کو اتنی ہی روٹی ملے جس سے وہ زندہ رہ سکیں اور اپنا کام کرتے چلے جائیں۔ یہی کوشش رہی ہے کہ کسان کو دبا کر رکھا جائے۔ ذرا کوئی کسان زور پکڑنے لگا کہ ایک بہت زبردست طعنہ گاؤں کی فضا میں گونج اُٹھا۔ جھکّے

جٹ کٹورا، بھا پانی پی پی اپھر یا" یعنی کمزور کسان کو کٹوری مل گئی۔ اور وہ پانی پی پی کر اپھر گیا۔ لیکن اب حالات بدل رہے ہیں۔ روس میں کسان مزدور کا راج قائم ہو چکا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ کسان مزدور کا راج یہاں قائم ہونا چاہیئے، بٹائی ضرور مٹ کر رہے گی۔

—— یہ سُسری بٹائی!

اُوپر آسمان پر، ٹھیک اس کی کھاٹ کے اُوپر کہکشاں نے پکے ہوئے کھیت کا روپ دھار رکھا تھا۔ وہاں کون کھیتی کرتا ہے۔ وہ سوچنے لگا، اس کی کنکوت کون کرتا ہے؟

بٹائی کون لیتا ہے؟

گیہوں کی کٹائی زوروں پر تھی۔ ہنسیے کہتے تھے ہمارے دانت تیز ہیں، ہمارے دانت ہمیشہ تیز رہیں گے۔ لوک گیتوں کی شعریت کی طرح دھرتی کی آبرو اُجاگر ہو اٹھی تھی۔ کسان سوچتے کہ بٹائی کے دانے دیکر بھی ان کے گھروں میں اتنا اناج پہنچے گا کہ وہ پرانے قرضوں سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ چار دن زندگی کو گدھا ناچ کے تال پر تھرکتے پائیں گے۔

کھلیان ہی کھلیان۔ مٹی کتنا سونا اگلتی آئی تھی۔ کسان خوش تھے۔ ان کے قہقہے دھرتی کی زندہ شکتی کے ترجمان تھے۔ کونجوں کی آخری قطاریں جو دور ہمالہ کے اس پار اپنی ماتر بھومی کو لوٹ رہی تھیں۔ کسانوں کا دھیان کھینچ لیتیں۔

چچا رحیمو نے اجاگر کا کندھا جھنجوڑ کر کہا۔ کنکیں، کونجیں مینہا جے رہن بیساکھیں" شرشع دنیا سے گیہوں ٹھیک موسم میں پکتا آیا ہے۔ اور ہمالہ پار کی کونجیں میدانوں میں جاڑے کے دن گزار کر گرمیاں شروع ہوتے ہی اپنے وطن کے لیے سفر پر تیار ہوتی آتی ہیں۔ اگر

گیہوں وقت پر نہ پکے اور کونجیں بیساکھ شروع ہوتے ہی اپنے سفر کی تیاری سے چُوک جائیں، تو یہ دونوں کے لئے طعنے کی بات ہوگی۔

اُجاگر بولا "آدمی ہونے کی بجائے ہم بھی ہمالہ پار کے پنچھی ہوتے تو نہ کوئی ہمارے کھیتوں کی کنکوت کرتا، نہ ہمیں ٹبائی کی مصیبت جھیلنی پڑتی"۔

چچا رحیمو حقے کے لمبے لمبے کش لگاتا رہا۔ وہ اُجاگر کی بات پر ہنس دیا "ناشکرا — خدا کا شکر نہیں کرتا۔ اتنی اچھی فصل میں سے دیوان کو تھوڑا اناج دیتے ہوئے موت تو نہیں آجائے گی۔ خدا تو سب کا رازق ہے۔ وہ دیوان کا بھی رازق ہے۔"

اُس وقت سنتو وہاں آنکلا اور بولا "لو چچا رحیمو! پنچایت میں آج یہ طے ہو گیا ہے کہ ٹبائی نہیں دی جائے گی"۔

چچا رحیمو نے ہنس کر کہا "سب سے بڑے ناشکرے تو تم ہو۔ ٹبائی لینے والا اپنی ٹبائی کیسے چھوڑ دے گا؟ چھوکروں کی پنچایت کی اس وقت کوئی پیش نہ جائے گی۔ جب پولیس کے سپاہی تمہیں پکڑ لے جائیں گے"۔

"پنچایت نرے چھوکروں کی تھوڑی ہے چچا رحیمو۔ تم نہ شامل ہوئے تو پنچایت کیسے رُک جاتی؟ گاؤں کے دوسرے بڈھے تو شامل تھے۔ اب پولیس کا ڈر بھی پنچایت کے فیصلے کو روک نہیں سکتا۔ اور میں دیکھوں گا کہ چچا رحیمو کب تک پنچایت سے باہر رہ سکتا ہے؟"

چچا رحیمو نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے حقے کا کش لگایا۔ پہلے وہ چپ رہا۔ سنتو کو اپنے ارادے پر اٹل دیکھ کر اس نے جھٹ اپنی بات کو پلٹتے ہوئے کہا "میں اکیلا

بٹائی کے دنوں میں

کیسے الگ رہ سکتا ہوں۔ اُجاگر بھی تو تمہارا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے ساتھ میں بھی پیاز اور جُوتے کھانے کو تیار ہوں۔"

پنچایت کا حکم تھا کہ کوئی بٹائی نہ دے۔ سب گیہوں کھلیانوں ہی میں پڑا رہے۔ پولیس آئے گی اور زبردستی بٹائی کے دانے دلانے کی کوشش کریگی۔ ہوسکتا ہے کہ دیوان ہمارے کچھ لوگوں کو رشوت دیکر اپنی طرف کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن بابا ٹہل سنگھ کی سمادھ پر کیا ہوا فیصلہ سارے گاؤں کو منظور تھا۔ واضح طور پر پنچایت نے لوگوں کی اس جدوجہد کے مختلف پہلو سمجھا دیئے تھے۔ کوئی پروا نہیں اگر ان کے کھلیان لہو سے لال ہو جائیں، ٹبائی سے ضرور خلاصی مل جائے گی۔

نمبردار نے بہت کوشش کی کہ چچا رحیمو پنچایت میں شامل ہونے سے انکار کر دے۔ دیوان کی طرفداری کرنے پر اسے بہت کچھ مل سکتا تھا۔ لیکن اس نے کسی طرح کی رشوت لینے سے انکار کر دیا اور کہا: "یہ پنچایت کا فیصلہ اللہ پاک کا فیصلہ ہے۔ ہم بزرگوں سے سُنتے چلے آتے ہیں کہ آوازِ خلق کو اللہ پاک کا نقارہ سمجھو۔"

کھلیانوں میں ہمیشہ ایک ہی گیت گونجتا رہتا:۔

"دینا نہیں کنک دا دانہ

بچہ بچہ قید ہو جائے!"

ہم گیہوں کا ایک بھی دانہ نہ دیں گے، بھلے ہی بچہ بچہ قید ہو جائے۔

مردوں سے کہیں زیادہ جوش عورتوں میں نظر آرہا تھا۔ عورتوں کا جلوس مائی امر

کے کنوئیں سے شروع ہوتا اور سیدھا دیوان کے دروازے پر جا پہنچتا۔ اس جلوس میں ہر عمر کی عورتیں اور لڑکیاں شامل ہوتیں "دینا نہیں کنک دا دانہ، بچہ بچہ کید ہو جائے۔" یہ گیت فضا میں گونج اٹھتا۔ بٹائی کے خلاف طرح طرح کے نعرے لگائے جاتے۔ پہلے دیوان نے اسے چند روز کا تماشا سمجھ کر بے توجہی دکھائی۔ لیکن عورتوں کے جوش میں کسی طرح کی کمی کا امکان نظر نہ آتا تھا۔ اب تو عورتیں دیوان کے دروازے پر چھاتیاں پیٹنے کا مظاہرہ شروع کر دیتیں۔ ہائے ہائے کے نعرے اس احتجاجی ماتم کی جان معلوم ہوتے تھے۔ دیوان حیران تھا، پولیس حیران تھی۔ اُوپر سے حکم آئے بغیر عورتوں پر کسی طرح کی سختی نہ کی جا سکتی تھی۔

رات کو دو دو تین تین فرلانگ سے گھگھر کے نعرے سنائی دیتے جن سے وہ گاؤں کے لوگوں کو بٹائی کے خلاف ڈٹے رہنے کیلئے برابر اُکساتا رہتا۔ دس سال کلکتے میں رہ کر وہ اگلے ہی مہینے گاؤں میں آیا تھا۔ منہ پر گراموفون کا بھونپو لگا کر وہ اپنی آواز کو دُور دُور تک پہنچا دیتا۔ عورتیں سوچتیں کہ ضرور اس نے بھوت بس میں کر رکھے ہیں۔ اور وہ اپنا نیا گیت اجتماعی لَے میں گاتیں۔ جو کچھ اس طرح شروع ہوتا کہ گھر گھر بیٹوں کا جنم ہوتا ہے۔ مگر گھگھر جیسا بہادر کبھی کبھار ہی پیدا ہوتا ہے۔ پولیس بھی سانپ کی طرح پھن مار کے رہ جاتی۔ گھگھر کو پکڑنا آسان نہ تھا۔

کھلیانوں کو عورتوں کی نگرانی میں چھوڑ کر، سب کسان ایک دن بابا ٹہل سنگھ کی سمادھ پر اکٹھے ہوئے۔ پولیس کے سپاہی موقعہ پر موجود تھے۔ گھڑسوار سپاہیوں کا ایک دستہ جو حال ہی میں ریاست کی راجدھانی سے چل کر یہاں آیا تھا۔ ہر طرح کی سختی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ چچا رحیمو نے

پھر آلو دہ نگاہوں سے گھڑسواروں کی طرف دیکھا۔ اور اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا:-

"جب میں بچہ تھا تو ہمیشہ اپنی بہن سے کہا کرتا تھا کہ اپنی کوہنی یا ناف کو زبان سے چھونے میں کامیاب ہو جاؤ تو تم لڑکی سے لڑکا بن سکتی ہو۔ وہ لاکھ کوشش کرتی پر نا کام رہتی۔ سیانی ہونے پر وہ بیاہی گئی۔ تین بچوں کی ماں بنی، بڑی نیک عورت تھی۔ میرا مذاق ہمیشہ قائم رہا ـــ کیوں بہن عورت سے مرد نہ ہو گی؟ وہ گھور کر میری طرف دیکھتی...... اور اب اس گاؤں کی عورتوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ کسی طرح بھی اپنے مردوں سے پیچھے نہیں، مردوں کو چاہیئے کہ پنچایت کی آواز سن لیں، اور جو فیصلہ ایک بار وہ کر چکے ہیں اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہیں"

اس کے بعد اُجاگر نے ہاتھ جوڑ کر ساری پنچایت کی فتح بلائی ـــ "بولو جی گرج کر شری واہگورو سادھ سنگت جی! میں نے سنا ہے کہ پہلے وقتوں میں ہر کسی کی ناف پر گوشت کی ایک ڈھکنی سی لگی رہتی تھی، جسے اُٹھا کر جب بھی کوئی چاہتا یہ دیکھ سکتا تھا کہ اس نے اس دن کیا کھایا ہے؟ ایک بار ایک لڑکی اپنے خاوند کیساتھ میکے میں آئی۔ اس نے اپنے خاوند کو اچھی اچھی چیزیں کھلائیں۔ اور اُسے خود صرف روٹی اور ساگ ہی ملا۔ خاوند نے پوچھا تم نے کیا کھایا۔ بولی وہی جو تم نے کھایا۔ جب وہ سو گئی خاوند نے اس کی ناف پر سے ڈھکنی اُٹھا کر دیکھ لیا۔ اور سب بات سمجھ گیا لڑکی کو معلوم ہوا تو اس نے دعا مانگی، ہے سچے واہگورو ناف پر کی ڈھکنی کو اب ہر مرد اور عورت کے جسم کے ساتھ ہی جوڑ دو تاکہ کوئی کسی کے بھوجن کے راز سے واقف نہ ہو سکے۔ اور ایسا ہی ہو گیا۔ ناف پر کی ڈھکنی کو جسم کے ساتھ جوڑ کر واہگورو نے کیا اچھا کیا

میں نہیں سمجھتا کاش! داتا گورو اس ڈھکنی کو پھر سے پہلی صورت دیدے۔ تا کہ ہمارے حاکم ہمارے بھوجن کے راز سے واقف ہو جایا کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ بہتوں کو روٹی اور ساگ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہمارے گاڑھے پسینے کی کمائی کچھ اتنی کم بھی نہیں۔ ایک تہائی دانے بٹائی کے نکل جاتے ہیں۔ ہنر کا لگان الگ۔ شاہوکار بیاج الگ۔ سادھ سنگت جی! اب بٹائی بند کرانے کا وقت آپہنچا ہے۔"

اتنے میں دور کہیں سے مگھر کا بگل ہنکار اُٹھا — بٹائی کے دن بیت گئے۔ زمین ہماری ہے۔ دیوان کی مہر ختم ...... اللہ اکبر ...... گرج کر بولو جی — بٹائی کے دن۔" جدھر سے آواز آ رہی تھی، ادھر ہی کو سب گھڑ سوار سپاہی بھاگ نکلے۔ انکے پیچھے پیچھے پیدل سپاہی لاٹھیاں اٹھائے بھاگے جاتے تھے۔

پھر ایک دن ریاست کی راجدھانی سے ٹھاکر صاحب باغی کسانوں سے بات چیت کرنے کے لئے چلے آئے۔ تھانے کی بغل میں سبز رنگ کے شاہی خیمے کے سامنے سب کسان حاضر ہو جائیں۔ بچے، بوڑھے اور جوان سبھی۔ کھلیانوں پر ایک ایک مرد یا عورت رہ جائے۔ رات کو گاؤں میں اور کھلیانوں میں یہ ڈھنڈورا پٹوا دیا گیا۔

• عورتیں اور مرد ایک جلوس کی شکل میں چلے آ رہے تھے۔ خیمے کے سامنے بہت سی سبز دریاں بچھا دی گئی تھیں۔ ایک طرف عورتیں بیٹھ گئیں۔ دوسری طرف مرد۔ ٹھاکر صاحب کی جے کا نعرہ گونج اٹھا۔ پلیشنر اس لئے کہ وہ مہاراج کے روبرو پہنچ کر فریاد کرتے مہاراج نے اپنا وزیر ان کا انصاف کرنے کو بھیج دیا تھا۔

ریاستی روایت کے مطابق سبز خیمے پر سبز جھنڈا لہرا رہا تھا۔ گھڑ سوار پولیس نے بھی آج اپنے خاکی لباس پر سبز پھندنے لگا رکھے تھے۔

کرسیوں پر بیچ میں ٹھاکر صاحب بیٹھے تھے۔ دائیں طرف تھانے دار اور بائیں طرف گاؤں کے جاگیر دار۔ دیوان صاحب۔ ٹھاکر صاحب کا اشارہ سمجھ کر تھانے دار نے کھڑے ہو کر کہا۔

"جو جس کی شکایت ہو بیان کر سکتا ہے۔"

دیوان صاحب نے کھڑے ہو کر بڑے ادب سے ٹھاکر صاحب کی دیکھا۔ اور پھر کسانوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر پُر شکایت لہجے میں کہا "میرے کسان میری بٹائی دینے سے انکار کر رہے ہیں حضور!"

کسانوں کو چپ دیکھ تھانیدار نے کہا "کیا تم لوگ بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

چچا رحیمو جسے سب لوگوں نے اپنا سرپنچ تسلیم کر لیا تھا کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے آواز سے نعرہ لگایا۔ جواب میں سب کسان یک زبان ہو کر بولے ـــــ اللہ اکبر!"

چچا رحیمو کے چہرے پر خوشی کی لہریں مچل رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی چھوٹے سے کا حکمران ہو اور ضرورت آن پڑنے پر اپنے پڑوسی حکمران کے ساتھ معاہدہ کرنے کے چل کر آیا ہو۔ بولا "ہم بٹائی نہیں دیں گے۔"

"کوئی وجہ بھی ہو آخر؟" ٹھاکر صاحب نے بظاہر خلوص سے پوچھا۔

"یہ پنچایت کی آواز ہے۔"

"پنچایت کی آواز؟ مگر ریاستی مہر کی آواز بھی تو کوئی چیز ہے۔"

چچا رحیمو نے مسکرا کر ٹھاکر صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے کسانوں کی طرف اٹھ گئیں۔ پہلے عورتوں نے اور پھر مردوں نے وہ نعرے لگائے جو انہوں نے پہلے پہل گھر کی زبان سے سُنے تھے۔ اور جو شروع شروع میں ان کی سمجھ میں نہ آتے تھے ــــ پنچایت کی آواز، کھیتوں کی آواز ــــ پنچایت کی آواز، گیہوں کی آواز۔

دیوان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ٹھاکر صاحب نے حالات پر قابو پاتے ہوئے کہا "ٹبائی توڑ سکنا میری طاقت سے باہر ہے۔ اس کے لئے تم لوگوں کو مہاراج سے عرض کرنا ہوگی۔"

چچا رحیمو بولا "تو ہماری آواز اُن تک پہنچا دی جائے۔"

"ٹبائی مہاراج بھی نہ توڑیں گے۔... میں کہتا ہوں ٹبائی ضرور دے دی جائے قانون یہی کہتا ہے۔... ہاں ایک بات ہو سکتی ہے اور وہ بھی فریقین کی رضامندی سے دیوان صاحب حاضر ہیں۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ ٹبائی گھٹا کر ایک تہائی کی بجائے ایک چوتھائی ٹھہرا دی جائے!"

چچا رحیمو بولا "پنچایت کی آواز ہے ٹبائی مت دو۔ ٹبائی کے دن بیت گئے۔ ایک چوتھائی ہی تو تھی پہلے یہ ٹبائی، پھر نہ جانے کون سا نشہ پلا کر ہمارے باپ دادا سے ایک تہائی ٹبائی پر انگوٹھے لگوا لئے گئے تھے۔ اب ہم جاگ چکے ہیں۔"

اُجاگر نے نعرہ لگایا" گج کہ بولو جی شری واہگورو"

سب کسان یک زبان ہو کر بولے" شری واہگورو"

چچا رجیمو ایک زندہ بُت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ پیچھے سے سنتو نے نعرہ لگایا۔

پنچایت کی آواز! سب کسان یک زبان ہو کر بولے گیہوں کی آواز!

ٹھاکر صاحب کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں لیکن جھٹ سے سنبھلتے ہوئے وہ بولے "ایک سنہری موقع گنوایا جا رہا ہے۔ ایسے موقعے روز روز نہیں آیا کرتے۔ بٹائی مہاراج بھی نہیں توڑ سکیں گے۔ ریاست کی مہر بھی کہتی ہے دیوان صاحب کی جدی جائیداد کا بھی یہی تقاضا ہے۔ پھر شاید ایک تہائی سے ایک چوتھائی کی سطح پر ہرگز ہرگز نہ آ سکے یہ بٹائی"

"ایک چوتھائی؟ ــــ ہم بٹائی نہیں دے سکتے"

گھڑ سوار پولیس کے گھوڑے تیار نظر آتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا وہ ابھی چچا رجیمو کو اپنے قدموں کے نیچے کچل کر رکھ دیں گے۔ سپاہیوں کے چہرے اور بھی خونخوار ہو اُٹھے تھے۔

ٹھاکر صاحب نے ایک بار پھر بڑے اطمینان سے کہنا شروع کیا۔" اچھا میں آخری بات کہے دیتا ہوں۔ اور وہ بھی دیوان صاحب کو پوچھے بغیر ہی ۔ . . . فصل کا پانچواں حصہ بٹائی منظور ہے سب کو؟ اور تم کہو گے تو کنکوت کا طریقہ بھی ترک کر دیا جائے گا۔ کٹائی ہو چکنے پر جنس کو تول کر پانچویں حصے کے دانے دیوان صاحب کو دیدیئے جایا کریں گے"

چچا رجیمو چپ کھڑا تھا۔ پیاز اور جوتے کھانے کا ڈر جیسے اسے چھو تک نہ گیا ہو۔ دیوان صاحب نے آداب بجا کر کہا۔" ٹھاکر صاحب آپ کے انصاف کے

سامنے میرا سر ہمیشہ جھکا رہے گا۔"

موقعہ پاکر سنتو نے پھر نعرہ لگایا ــــ پنچایت کی آواز!

سب کسان یک زبان ہو کر بولے ــــ گیہوں کی آواز!

اُجاگر نے نعرہ لگایا ــــ بٹائی کے دن!

سب کسان یک زبان ہو کر بولے ــــ ختم ہو گئے!

چچا رحیمو نے کہا "میں اکیلا کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں پنچایت سے پوچھ دیکھوں۔ دوپہر تک ہمارا فیصلہ آپ کو پہنچ جائے گا۔"

سب کسان جلوس کی شکل میں جا رہے تھے۔ ان کا گیت فضا میں گونج اٹھا ــــ

"دینا نہیں کنک دا دانہ، بچہ بچہ کید ہو جاتے۔"

بابا تہل سنگھ کی سمادھ پر پنچایت اپنے آخری فیصلے پر غور کر رہی تھی۔ سنتو کا خیال تھا کہ ابھی پانچواں حصہ بٹائی منظور کر لی جائے۔ مگر چچا رحیمو نے بڑے جوشیلے انداز میں جنتا کے روبرو اپنے خیالات پیش کر دیئے اور کہا "آؤ ہم آج ہمیشہ کے لئے بٹائی سے آزاد ہو جائیں۔" سب لوگ چچا رحیمو کے ساتھ تھے۔ سنتو نے نعرہ لگایا ــــ پنچایت کی آواز چچا رحیمو کی آواز!"

اُجاگر جھٹ پنچایت کا فیصلہ ٹھاکر صاحب کے خیمے میں پہنچا آیا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ آج ٹھاکر صاحب مہاراج کا آخری حکم سنا دیں گے اور ہمیشہ کے لئے اپنے کسانوں کو بٹائی کے جوئے سے آزاد کر دیں گے۔ دیوان صاحب کو ریاست کے خزانے سے پنشن

ٹبائی کے دنوں میں
جا سکتی تھی۔

لیکن دوپہر ڈھلنے سے پیشتر ہی پتہ چل گیا کہ ٹھاکر صاحب پولیس سمیت کھلیانوں کی طرف آ رہے ہیں۔ تاکہ زبردستی ٹبائی کے دانے دیوان صاحب کو دلا دیں۔ چچا رحیمو نے حکم دیا کہ سب عورتیں تیار رہیں جس جس کھلیان میں پولیس کے سپاہی یہ زبردستی شروع کرنے والے ہوں اسی کے گرد گھیرا ڈال کر، دھرنا مار کر مقابلہ کریں۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ پانی پلانے کا فرض ادا کریں۔

گھڑ سوار پولیس کو دیوان صاحب کے دروازے پر پہرا دینے کا حکم ملا۔ کیونکہ یہ ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں بے قابو ہجوم کسی طرح کی زیادتی پر نہ اتر آئے۔

پیدل پولیس سمیت تھانیدار اور دیوان صاحب بابا تھل سنگھ کی سمادھ کے قریب ایک کھلیان میں پہنچے۔ لیکن عورتیں اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔ کہ ٹبائی کے دانے تلوانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ تھوڑی دیر میں ٹھاکر صاحب کی کار بھی پہنچ گئی۔

"میری ماؤں بیٹیو، ایک طرف ہٹ جاؤ، سپاہیوں کو سرکاری کام کرنے دو۔" ٹھاکر صاحب نے بظاہر خلوص سے کہا۔

عورتیں اپنے دھرنے پر بضد تھیں۔ ٹھاکر صاحب نے ایک بار پھر اپنا حکم دوہرایا تیسری بار گرم ہو کر انہوں نے اپنا حکم دیا "یوں نہیں مانتیں تو ہٹا دو ان کو بازوؤں سے پکڑ کر۔"

سپاہی ابھی آگے بڑھنے ہی والے تھے کہ پانی پلانے والے نوجوانوں کو جوش آ گیا۔ ان میں سنتو بھی شامل تھا۔ ان نوجوانوں نے سپاہیوں کی لاٹھیاں چھین لیں اور سنتو کا اشارہ سمجھ کر بری طرح ان سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ خود سنتو نے اپنی تیل پلائی ہوئی لوہے کی میٹھے والی لاٹھی جو اس نے کھلیان میں چھپا رکھی تھی، اٹھا کر تابڑ توڑ اتنے وار کئے کہ کھلیان کی خشک زمین پر لہو کے چھینٹے نمایاں ہوا اٹھے۔ پیشتر اس کے کہ ٹھاکر صاحب کو گولی چلانے کی ضرورت محسوس ہوتی، دیوان صاحب نے ہوا میں اپنی بندوق چلا دی۔ سب نوجوان بھاگ گئے۔ سنتو ذرا دیر سے بھاگا۔ لیکن ایسا بھاگا، کہ دو فرلانگ تک گھڑسوار تھانیدار بھی اسے پکڑ نہ سکا۔

عورتیں بالکل نہ گھبرائیں۔ اپنے دھرنے پر ڈٹ کر کھڑی رہیں۔ چچا رحیمو کا حکم ان کے لئے سب سے بڑا حکم بن چکا تھا۔ لیکن ان کے دیکھتے دیکھتے چچا رحیمو کو گرفتار کر لیا گیا۔ بیویوں کے خاوند، بہنوں کے بھائی، بیٹیوں کے باپ اور ماؤں کے بیٹے سب گرفتار کر لئے گئے۔ سنتو کو بھی ہتھکڑی پہنائی جا چکی تھی لیکن عورتیں بالکل نہ گھبرائیں۔ ٹھاکر صاحب نے حکم دیا۔ کہ سنتو کے پاؤں میں پورے من بھر لوہے کی بیڑی ڈالی جائے۔ دو سپاہی بھاگے بھاگے تھانے سے وہ بھیانک بیڑی لے آئے۔ عورتوں کے روبرو سنتو کے پاؤں میں وہ بیڑی ڈال دی گئی۔ وہ ذرا نہ گھبرایا۔ "پنچایت کی آواز، گیہوں کی آواز" اس نے بلند آواز سے نعرہ لگایا اس سے بہت پوچھا گیا، کہ وہ باقی پانی پلانے والے نوجوانوں کے نام بتا دے۔ لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ نوجوان نہ جانے کہاں جا چھپے تھے۔

"بدمعاش کی پیٹھ ننگی کر کے خوب کوڑے لگاؤ جب مانے گا۔" ٹھاکر صاحب نے سنتو کی طرف خونی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

سنتو کی پیٹھ دھوبی کا تختہ بن چکی تھی۔ جگہ بہ جگہ اس پر نیل پڑ چکے تھے لیکن وہ برابر کہے جا رہا تھا — بٹائی کے دن بیت گئے۔

ایک طرف ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دھرتی کے بیٹے کھڑے تھے جن کی آنکھوں میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ دوسری طرف کھلیان کے گرد دھرتی کی بیٹیوں نے دھرنا مار رکھا تھا۔ انہیں اپنی جگہ سے ہٹنا منظور نہ تھا۔ چچا رحیمو اب قیدی بن چکا تھا۔ لیکن اس کا حکم اب بھی پنچایت کا حکم تھا۔ اور انہیں یقین تھا۔ کہ بٹائی کے دن کبھی کے بیت چکے ہیں۔

"تو نے کیا کہا کر جبا تھا سنتو کو نہالو؟" پیلی شلوار قمیص والی ایک عورت پوچھ رہی تھی۔ سنتو کی منگیتر اپنے ہونے والے دولہے کی طرف چور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ خو... تھانیدار اور ٹھاکر صاحب اپنے ہاتھوں سے سنتو کے بال نوچ رہے تھے۔ دیوان صاحب چلا رہے تھے۔ "یہی حرامی ساری بغاوت کا بانی مبانی ہے۔ ہم اسے زندہ نہ چھوڑینگے"

ایم ظہیر پرنٹر و پبلشر منیجر کتاب خانہ پنجاب نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر لوہاری گیٹ لاہور سے شائع کیا